# کتابچہ لکھنے کی غرض و غایت

یہ کتابچہ سانجھ کے ممبران کی ابتدائی تعلیم کے لیے لکھا گیا ہے۔ تحریر کو اعداد و شمار اور دیگر اصطلاحات سے بوجھل نہیں کیا گیا۔ اسی لیے اس کا نام بھی ''پہلی کتاب'' ہی رکھا گیا ہے۔ اس سے مبتدی کو ہمارے معاشرے کی طبقاتی بناوٹ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس میں موجود معاشی و سیاسی عمل کو جاننے میں معاونت ہوگی۔ جمود اور جمودی قوتوں پر روشنی پڑے گی۔ ان حالات میں آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

چونکہ 29 مارچ 1849ء کو شاہی قلعہ لاہور میں انگریزوں نے اعلان کیا تھا پنجاب آج سے ہمارا غلام ہے۔ اُس وقت تک برطانیہ ایک صنعتی ملک بن چکا تھا اور اس کے اس خطے میں مفادات یکسر تبدیل ہو گئے تھے ان مفادات کے پیشِ نظر انہوں نے یہاں جو سیاسی سماجی عدالتی ریاستی تعلیمی اور فوجی ڈھانچہ تشکیل دیا اسے کالونیل ڈھانچہ کہتے ہیں۔ سانجھ کا قیام چونکہ کالونیل ڈھانچے کو سمجھنا اور اس کی تباہ کاریوں سے لوگوں کو روشناس کروا کر اس ڈھانچے کو عوام کی امنگوں اور خواہشات کے تابع کرنا ہے اس لیے یہ کتابچہ کالونیل مفادات کو سمجھنے اور اس کے خلاف لڑنے میں مددگار ہوگا۔

پنجاب پر قبضہ کے بعد برطانوی سامراج نے اس خطے کو برطانوی مصنوعات کے لیے خام مال پیدا کرنے کی پالیسی پر پروان چڑھایا اس لیے یہاں تعلیم کو غیر پیداواری رکھا گیا۔ یعنی تعلیم برطانوی مصنوعات کی کھپت کے لیے سازگار ماحول مہیا کرے۔ پھر برٹش انڈین آرمی میں کل تعداد کا نصف پنجاب سے بھرتی کی جاتی تھی۔ اس غرض کے لیے پنجاب کے خطے کو غیر سیاسی رکھنا بڑا ضروری تھا تاکہ یہاں آزادی کا شعور پیدا نہ ہو۔ پھر یہ خطہ اپنے پورے کالونیل ورثے کو لے کر بظاہر آزاد ہو گیا تو بیوروکریسی اس پورے کالونیل ڈھانچے پر



Sanjh Lok Raj

حکمران ہوگئی تو انہوں نے کالونیل پالیسیوں کو جاری رکھا۔ بعدازاں بار بار کے مارشل لاء عوام کو غیر سیاسی بنانے کے لیے جو حربے استعمال کرتے رہے اس کے نتیجے میں ہماری علمی و شعوری سطح کو ایک خاص مقام سے آگے نہیں جانے دیا جاتا۔ دنیا بہت آگے چلی گئی ہے ہم جسمانی طور پر اکیسویں صدی اور ذہنی طور پر سولہویں صدی میں رہ رہے ہیں۔ یہ کتابچہ اس فاصلے کو کم کرنے میں بھی مدد دے گا جب سانجھ کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کا بنیادی مقصد تھا لوک راج۔ یعنی عوام کا اقتدار۔ اور عوام کا اقتدار تب تک ممکن نہیں جب تک عوام خود سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ سیاست کا مطلب ہے امور مملکت میں حصہ لینا۔ جو لوگ سیاست سے کنارہ کش ہوں گے ان پر کوئی دوسرے لوگ حکومت کریں گے۔ اس لیے اس کتابچہ کے ذریعے مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، وکلاء، اساتذہ اور خواتین کی 54 فیصد آبادی کو سیاسی عمل میں شریک کرنے کے لیے ان کی سیاسی تعلیم کرنا ہے۔

پاکستان میں کالونیل پالیسیوں کی وجہ سے تعلیم صرف حرف شناسی تک ہی محدود نہیں رکھی گئی بلکہ اس کے ذریعے خود کو ماضی کے مطابق ڈھالنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ علاوہ ازیں سیاسی و تعلیمی اصطلاحات کو اپنی مرضی کا مطلب دے کر اس کی تشہیر کی گئی جیسے سیکولرازم کو لادینیت کا نام دیا گیا۔ اس سے یہ ہوا کہ ہر وہ اصطلاح جس نے شعور میں اضافہ کرنا تھا اور لوگوں میں حرکت پیدا کرنی تھی اسے جمود پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ کتابچہ ایسے سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔

پاکستان کی معیشت کو زراعت پر جامد رکھا گیا تاکہ یہاں جاگیرداروں کا راج رہے۔ اگر جاگیرداری کمزور پڑنے لگے تو فوج مارشل لاء لگا کر ان میں دوبارہ زندگی پھونک دے۔ تاکہ تمام سیاسی پارٹیاں کسی پروگرام کی بجائے ایک خاندان کے خوشامدی وفاداروں کا بے ترتیب ہجوم ہیں اس عمل کو آج بھی زرعی انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کتابچہ اس پالیسی کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

محمد مسعود خالد
چیئرمین ''سانجھ''
0300-6943894

Sanjh Lok Raj

# ارتقاء

ارتقاء کا مطلب ہے ترقی۔ آگے بڑھنا، پھلنا پھولنا۔ اس کے مدمقابل جمود کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جمود کا مطلب ہے ایک ہی جگہ ٹھہرے رہنا یا ایک ہی دائرے میں حرکت کرنا یعنی جہاں سے شروع کرنا وہیں واپس آجانا۔ دنیا میں کوئی چیز ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں۔ ہر چیز مسلسل تبدیلی کے عمل سے گذر رہی ہے۔ جوں جوں گھڑی کی سوئی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلیاں ہمیشہ ناقابلِ واپسی ہوتی ہیں۔ ان ناقابلِ واپسی تبدیلیوں ہی سے وقت کا تصور ابھرتا ہے۔ جیسے کسی ایک جگہ پر کسی خشک ٹہنی پر ایک کونپل پھوٹی اُسی لمحے کرۂ ارض پر کئی بچے دنیا میں آئے کئی لوگ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جو لوگ سفر میں تھے انہوں نے کتنا سفر طے کرلیا۔ دریاؤں سے کتنا پانی گذر گیا۔ کتنے لوگوں نے کھانا کھایا۔ کتنی فصل بوئی گئی۔ کتنی کاٹی گئی۔ کتنے گلیشیئر پگھلے وغیرہ الغرض ایک کونپل کا پھوٹنا ایک اکلوتا واقعہ ہے مگر یہ اکلوتا واقعہ پوری کائنات میں رونما ہورہی حرکت کے ساتھ جُڑا ہوا ہے۔ ایک کونپل پھوٹنے کے واقعے کو یعنی اس تبدیلی کو واپس کرنے کا مطلب ہے پوری کائنات میں ہورہی حرکت کو پیچھے دھکیلنا، یہ ممکن نہیں۔ ارتقاء نہ صرف بے جان مادے کا بلکہ زندگی کا بھی بنیادی اصول ہے۔ علوم سائنس کی ترقی نے انسان کو اس قابل بنایا ہے کہ اس نے آج سے کروڑوں سال پہلے اس کرۂ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں کا بھی صحیح صحیح علم حاصل کرلیا ہے۔

لیکن اس سٹڈی سرکل کا مقصد انسانی معاشرے یا سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو زیرِ بحث لانا ہے۔ آگ کا استعمال سیکھنے سے پہلے کا انسان اُس انسان سے بالکل مختلف تھا جس



Sanjh Lok Raj

نے ابھی آگ کا استعمال نہیں سیکھا تھا۔ شکار پر گذارا کرنے والا انسان اس انسان سے بالکل مختلف تھا جس نے زراعت سیکھی۔ صنعتی دور کا انسان زرعی سماج سے بالکل مختلف ہے۔ یہ دنیا ابتداء ہی سے ایسی نہیں تھی جیسی آج ہے۔ یہ مسلسل تبدیلیوں کے عمل سے گذر رہی ہے۔ آپ سفر ہی کو لیجئے۔ ابتدائی غار کے زمانے میں انسان پیدل سفر کیا کرتا تھا۔ اس سفر کی ضرورت اُسے شکار کی تلاش کی وجہ سے پڑتی تھی۔ پھر جب انسان نے زراعت سیکھی اور دریاؤں کے کنارے ابتدائی بستیاں آباد کیں۔ تو زراعت کی ضرورت کے مطابق اور نقل وحمل کے لیے گھاس خور جانوروں کو قابو میں کیا۔ پہاڑ سے لڑھکتے ہوئے گول چپٹے اور چورس پتھروں کے نیچے کی طرف آنے کی رفتار کے مشاہدے سے انسان نے پہیہ ایجاد کرلیا۔ پہیہ گاڑی بنائی۔ اس گاڑی میں جانور جوت کر نقل وحمل کو آسان بنایا۔ ہزاروں سال انسان نے پہیہ گاڑیاں استعمال کیں پھر ڈیزل انجن ایجاد ہوگیا تو پہیہ گاڑیوں میں جانوروں کی جگہ اب مشین نے لے لی۔ ریل گاڑی آئی۔ بُلٹ ٹرین بنی۔ ہوائی جہاز سے راکٹ تک کا سفر ارتقاء ہی کی کہانی تو ہے۔ غاروں سے اپنی تہذیبی زندگی کا آغاز کرنے والے انسان نے اب بڑے بڑے شہر آباد کر لیے ہیں اور انہیں سڑکوں اور ہوائی راستوں سے جوڑ لیا ہے۔

ایک تبدیلی دوسری تبدیلیوں کو جنم دیتی۔ ایک نسل اپنے تجربات کو آئندہ نسلوں کو منتقل کرتی ارتقاء کے عمل کے جاری رہنے کا باعث بنتی ہے۔ پتھر اور لکڑی کے پہیے کو پختہ سڑک کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کچی سڑکیں ہوا کرتی تھیں۔ رفتار کا بھی کوئی خاص تصور نہیں تھا۔ ربڑ کا پہیہ آیا تو پختہ سڑک کی ضرورت پیش آئی۔ رفتار کا تصور پیدا ہوا۔ اس طرح ایک تبدیلی دوسری تبدیلی کا پیشہ خیمہ بنتی گئی۔ بیل گاڑی کے زمانے میں چھاپہ خانہ اگرچہ ایجاد ہو چکا تھا۔ مگر اخبار کا رواج ریل گاڑی کے بعد ہی پیدا ہوسکتا تھا۔ اس طرح اردگرد چیزوں میں تبدیلی دراصل خیالات میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سولہویں صدی کے خیالات اکیسویں صدی کے انسانوں کے خیالات سے بہت پسماندہ ہوں گے آج اگر ہم ماضی میں ہونے والے ارتقاء کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ سے دو ہی طاقتیں برسرپیکار رہی ہیں۔ پہلی جمودی طاقتیں۔ جو معاشرے کو اور اس میں پھیلنے والے خیالات کو ایک ہی حالت پر ٹھہرا رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ جمودی طاقتیں حکمران طبقہ اور ان کے

وفاداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔

دوسری ارتقائی طاقتیں۔ جو محنت کش طبقہ اور اس طبقے کے خیر خواہوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جو تبدیلی کی طرف گامزن رہتی ہیں۔ معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہیں۔ تاریخ کا سفر اور خیالات انہی دونوں قوتوں کے آپس میں ٹکرانے کا نتیجہ ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ارتقائی طاقتیں ہی ہمیشہ کامیاب ہوئی ہیں ورنہ انسان آج بھی غاروں میں زندگی بسر کر رہا ہوتا۔

سماج کی سائنس کے عالموں نے بتایا ہے کہ جب یورپی ممالک میں پیداوار کا واحد ذریعہ زراعت تھی تو زرعی معیشت جاگیردار طبقے کے ذریعے بادشاہت کا سیاسی نظام قائم کرنے کا باعث بنی۔ پھر سماج کے درمیانے طبقے میں صدیوں تبدیلی کا عمل جاری رہا۔ ایجادات ہوئیں۔ مشین آ گئی۔ مشین نے صنعت کو جنم دیا اور صنعت کی معیشت نے دو بڑے طاقتور اور آپس میں متحارب طبقے پیدا کیے۔ ایک صنعت کار اور دوسرے مزدور۔ صنعت کاروں کو اپنے کارخانوں کی مصنوعات کھلی منڈی میں فروخت کرنے کے لیے ایک نئے سیاسی نظام کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے جاگیرداروں سے لمبی لڑائیاں لڑ کر بادشاہتوں کا خاتمہ کر کے سرمایہ دارانہ جمہوریت قائم کر دی۔ اس لڑائی میں جاگیردار ایک جمودی قوت تھے جبکہ صنعت کار ایک ارتقائی قوت۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جمودی اور ارتقائی قوتوں میں جدل یعنی لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں سماج آگے بڑھتا رہتا ہے۔

دنیا بھر میں جمودی قوتوں کے اپنے نظریات ہوتے ہیں جبکہ ارتقائی قوتوں کے اپنے الگ نظریات ہوتے ہیں جمودی قوتیں اپنے جمودی نظریات کے پرچار کے ذریعے معاشرے کو جامد رکھنے پر اپنا پورا زور لگاتی ہیں۔ جبکہ ارتقائی قوتیں جدید اور ترقی پر گامزن کرنے والے نظریات کے پرچار کے ذریعے معاشرے کو آگے بڑھانے کے لیے برسرپیکار رہتی ہیں۔ ان دونوں قوتوں کے خیالات میں فرق کی خاص نشانی یہ ہے کہ جمودی قوتیں ماضی پرست ہوتی ہیں اور زمانہ حال کو ماضی کے مطابق ڈھالنے کا پرچار کرتی ہیں جبکہ ارتقائی قوتیں مستقبل کی منصوبہ بندی کرتی ہیں۔

آپ تاریخ کے علم ہی کو لیجئے۔ جمودی قوتوں کا نظریہ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی



Sanjh Lok Raj

ہے۔ جبکہ تاریخ کا ریکارڈ یہ ثابت کرتا ہے کہ تاریخ کا اُٹھایا ہوا قدم کبھی واپس نہیں جاتا۔ تاریخ تبدیلیوں کا مسلسل آگے بڑھنے والا سفر ہے۔

اس کا ایک لمحہ بھی واپس نہیں لوٹایا جاسکتا۔ دنیا کو جامد ثابت کرنے میں جمودی قوتوں کا فائدہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ محنت کش طبقہ جتنی کوشش بھی کرلے ان کے حالات نہیں بدلیں گے۔ اس یقین دلانے کی کوشش میں وہ جاگیرداری کی عمر بڑھانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ اس کے مدمقابل ارتقائی قوتوں کا مقصد محنت کش طبقہ کو آزادی اور خوشحالی دلانا ہوتا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب محنت کش طبقہ خود ایسی تبدیلی لانے کے لیے آمادہ ہو۔ یہ آمادگی انہیں زمانے کی حقیقتوں سے روشناس کروا کر، تبدیلی کے عمل پر ان کا اعتماد بحال کرکے کی جاسکتی ہے۔

محنت کش طبقے میں اعتماد کی مثال ایسی ہے جیسے سرکس میں ہاتھی کے بچے کو سنگل سے باندھ دیا جاتا ہے۔ وہ سنگل توڑنے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے مگر زنجیر نہیں ٹوٹتی۔ لیکن جب وہ جوان اور طاقتور ہوجاتا ہے اور زنجیر توڑنے کے قابل ہو جاتا ہے تب تک وہ غلامی کی زنجیر کو ذہنی طور پر قبول کرچکا ہوتا ہے زنجیر توڑنے کی سوچ رکھنے والے کو بچہ سمجھتا ہے کیونکہ ایسی سوچ اس کے بچپن کی یادگار ہے اور غلامی کو قبول کرلینا ذہنی پختگی اور عقلمندی سمجھتا ہے۔

انسانی سماج میں ارتقا انسانی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ یعنی سماجی ارتقا ایک ارادی عمل ہے۔ تبدیلی کی خواہش ہی تبدیلی لانے پر آمادہ کرتی ہے۔ مگر حکمران طبقہ ایک خاص کلچر، تعلیم، ادب وفن، مذہب اور حتی کہ کہانیوں کے ذریعے معاشرے میں ایسی سوچ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے محنت کش طبقے میں تبدیلی کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔

سانجھ وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ جب تک سماج میں یہ شعور اجاگر نہیں ہوتا کہ دنیا مسلسل تبدیلی کے عمل سے گذر رہی ہے اور ان تبدیلیوں میں انسان کا اپنا ارادہ اور کوشش شامل ہے تب تک یہ معاشرہ جامد رہے گا۔ اس پر جاگیرداروں، بیوروکریٹس اور فوج کا راج رہے گا۔

ارتقا اور مثبت تبدیلی کو زندگی کا بنیادی اصول مان کر محنت کش طبقہ کے نوجوانوں میں سماج کو تبدیل کرنے کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا سانجھ کا ابتدائی قدم ہے۔

Sanjh Lok Raj

# بایاں بازو

انقلاب کے بعد فرانس کی اسمبلی نے 1791ء میں ملک کا نیا دستور بنایا جس کے تحت انہوں نے بادشاہت کے ادارے کو تو قائم رکھا مگر اس کے اختیارات کم کر کے اسے دستور کے ماتحت کر دیا۔ بادشاہ نے اپنی وفادار فوج کے ذریعے انقلاب کے عمل اور اس کے نتائج کو ختم کرنا چاہا جس سے بادشاہ کے خلاف مظاہرے بھڑک اُٹھے۔اسمبلی نے جلدی جلدی دستور منظور کر کے خود کو توڑ دیا اور نئے انتخابات کروا دیئے۔ 1791ء کے انتخابات میں دستور کے مطابق پرانے اراکین نے حصہ نہیں لیا۔ جیتنے والے نئے اراکین کی اکثریت کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔ یہ اسمبلی دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ جو اپنی نشستوں کے اعتبار سے دائیں بازو اور بائیں بازو والے کہلائے۔ دائیں بازو والے دستوری بادشاہت کے حق میں تھے جبکہ بائیں بازو والے مکمل جمہوریت کے۔تب سے یہ لفظ سیاست میں اصطلاح کے طور استعمال ہونے لگے۔ دائیں بازو سے مراد وہ لوگ لیے جاتے ہیں۔ جو معاشرے کو جوں کا توں رکھنے پر بضد رہتے ہیں۔ معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ میں کسی قسم کی تبدیلی کی زبردست مخالفت کرتے ہیں۔معاشرے میں ہونے والے ارتقا اور ترقی لانے والی قوتوں کے خلاف جنگ جاری رکھتے ہیں۔اس کے برعکس بائیں بازو سے مراد ان لوگوں سے لی جاتی ہے جو معاشرے میں معاشرہ کی بہتری کے لیے بنیادی تبدیلیاں لانے کے خواہش مند ہیں۔

معاشرے کی ترقی میں ایک قدم اور آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔تاریخ دانوں نے جب ماضی کی تمام تاریخ پر نظر دوڑائی تو ہر معاشرے میں اور ہر عہد میں دو قوتیں برسرِ پیکار پائیں۔اور ہر عہد میں بائیں بازو کی جدوجہد سے ہونے والی ترقی کا سراغ لگالیا۔



Sanjh Lok Raj

انسان غاروں میں رہتا تھا اور شکار کا کچا گوشت کھا کر اپنی زندگی گذار رہا تھا۔ جب انسان نے آگ جلانا سیکھی۔ دریاؤں کے نزدیک بستیاں آباد کیں۔ تمدن کا دور شروع ہوگیا۔ لوگ قبائل کی صورت میں اکٹھے رہنے لگے۔ درختوں کے پتوں کی جگہ کپڑے سے تن ڈھانپنے لگے۔ کھیتی باڑی کے دور میں ہی بہت سے قبائل نے مل کر ایک وسیع سلطنت کی شکل اختیار کرنا شروع کردی۔ اور بہت سے قبائل میں سب سے طاقتور قبیلے کے سردار کو سب نے اپنا بادشاہ بنالیا۔ سلطنتیں وجود میں آئیں۔ سلاطین کا وجود قائم ہوا۔ اُس وقت بھی معاشرے میں دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو پرانے قبائلی نظام کو برقرار رکھنے پر بضد تھے۔ دوسرے وہ جو بہت سے قبائل کو ملا کر سلطنت وسیع کرنے کے حق میں تھے۔ قبائل کو قائم رکھنے والے اپنے عہد کے دائیں بازو کے لوگ تھے اور اسے ترقی اور تبدیلی سے ہمکنار کرنے والے بائیں بازو کے۔

یہ زرعی معاشرہ دس ہزار سال تک قائم رہا۔ یہاں تک کہ 19 ویں صدی میں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ جس نے زرعی معاشرے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے۔ مطلق العنانیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ نوابوں اور جاگیرداروں کی جگہ سرمایہ داروں نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ بڑی صنعت نے گھریلو دستکاری کا خاتمہ کردیا۔ ایجادات کی رفتار تیز ہوگئی۔ سائنس کی روشنی نے جہالت کی تاریکی کو ختم کردیا۔ عوام میں بیداری آئی۔ اپنے حقوق کی پاسبانی کا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگ ووٹ کے ذریعے اپنے حکمرانوں کا انتخاب کرنے لگے۔

اس وقت بھی اس معاشرے میں دو قسم کے افراد موجود تھے ایک وہ جو پرانے بادشاہی دور کے حامی تھے دوسرے وہ جو جمہوریت کے حق میں تھے۔ بادشاہت اور جاگیرداری کے حامی دائیں بازو کے لوگ تھے اور صنعتی جمہوری انقلاب کے حامی اپنے زمانے کے بائیں بازو کے لوگ تھے۔ انگلستان میں چارلس اول جو کہ بادشاہ تھا اور کرامول جو کہ عوام کا منتخب نمائندہ تھا ان کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی اور بالآخر جمہوریت پسندوں کو فتح حاصل ہوئی بادشاہوں کے تختے اُلٹنے لگے۔ اسی دور میں فرانس میں انقلاب برپا ہوا۔ یہ سب تبدیلیاں اپنے زمانے اور وقت کی بائیں بازو کی تحریکوں کی بدولت رونما ہوئیں۔

کیونکہ صنعتی انقلاب نے انسانی زندگی کو اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز کو

Sanjh Lok Raj

معیشت کو سیاست کو یکسر بدل دیا۔ پھر تاریخ نے ایک اور کروٹ لی۔ جمہوریت جہاں وڈیرے اور سرمایہ دار محنت کشوں کو ووٹ لے کر برسراقتدار آ جاتے تھے اور محنت کشوں کے مسائل کا رونا رو کر اور خود کو غریبوں کا ہمدرد جتا کر برسراقتدار آتے اور محنت کشوں کو کچلنے کے قوانین بناتے انہیں بیروزگار اور جاہل رکھتے۔ ایک اور بائیں بازو کی تحریک نے جنم لیا۔

محنت کشوں نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اشتراکی معاشرہ قائم کردیا۔ جس کی بنیاد معاشی انصاف پر رکھی گئی۔ محنت استحصال سے اور محنت کش جبری بیگار سے آزاد ہوگیا۔ تعلیم مفت عام اور ہر طبقہ کے لیے ایک جیسی ہوگئی۔ انسانی صلاحیتیں ذاتی غرض براری کی بجائے عوامی فلاح و بہبود کے لیے وقف ہونے لگیں۔ تاریخ انسانی کا ارتقا اس بات کا واضع ثبوت ہے کہ ہمیشہ بائیں بازو کی فتح یقینی رہی۔ اگر بائیں بازو کی فتح یقینی نہ ہوتی تو انسانی ابھی غاروں میں ہوتا۔ اور تاریخ نے یہ بھی ثابت کردیا کہ آج تک ہونے والی تمام تبدیلیاں بائیں بازو ہی کی بدولت رونما ہوئیں۔ تاریخ کا پہیہ جام کرنے والی قوتوں نے ہمیشہ منہ کی کھائی۔ اور تاریخ کے ارتقا کی معاون قوتیں کامیاب ہوئیں۔ اگر بایاں بازو نہ ہوتا تو دنیا کی تاریخ نہ ہوتی۔ یہ تھا تاریخ کا اب تک کا سفر جو بائیں بازو نے طے کروایا۔ لیکن پاکستان میں کیا بایاں بازو ہے؟

پاکستانی معاشرہ نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ معاشرہ ہے۔ اور قیام پاکستان سے پہلے انگریز کا پیدا کردہ جاگیردار طبقہ برسراقتدار ہے۔ عوامی قوتیں عوام کے سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے انگریز سے ورثہ میں ملی ہوئیں ملٹری اور بیوروکریسی کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ اس مرحلہ پر مارشل لاء جاگیرداری کی حامی قوتیں پاکستان کا دایاں بازو ہیں اور عوام کے سیاسی معاشی حقوق حاصل کرنے کے لیے جاگیرداری وڈیرہ شاہی کے خلاف لڑنے والی قوتیں جو پاکستان کو غریب عوام کے لیے ایک فلاحی ریاست بنانا چاہتی ہیں۔ جو ملک میں صنعتی انقلاب لا کر بیروزگاری کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ جو ملک کو خود انحصار اور خود مختاری کی منزل پر پہنچانا چاہتی ہیں تعلیم کی سہولتیں مفت اور عام کرنا چاہتی ہیں وہ بائیں بازو کے لوگ ہیں۔

اگر آپ محبّ وطن انسان دوست اور پاکستان میں محنت کش طبقہ کے سیاسی اور معاشی حقوق کی بحالی چاہنے والے ہیں تو یقیناً آپ کا دل بھی بائیں طرف دھڑکتا ہوگا۔

# بنیاد پرستی

بنیاد پرستی دراصل ایک سوچ کا نام ہے جو قدیم کو جدید پر برتر سمجھتی ہے اس سوچ کے مطابق ماضی کی ہر چیز مکمل اور سودمند تھی۔ ماضی کا دور سنہری دور تھا ان کی سوچ کے مطابق جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے ہر چیز تنزل کی طرف جارہی ہے۔

ہر معاشرے میں دو قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ ایک جمودی اور دوسرے ارتقائی جمودی خیالات کے حامل لوگ موجودہ زندگی کو ماضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اس کے لیے انہیں ایسے خیالات کی ترویج کی ضرورت ہوتی ہے جو معاشرے کو جامد رکھیں۔ ارتقائی خیالات کے حامل لوگ مستقبل کی منصوبہ بندی کرکے ترقی کی بنیادیں موجودہ زمانے میں رکھتے ہیں۔ بنیادی پرستوں میں زیادہ تر لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا اختیار و اقتدار معاشرے کو جامد رکھنے ہی سے قائم رہتا ہے۔ ان جمودی طاقتوں کو بنیاد پرست یا دایاں بازو بھی کہا جاتا ہے۔

یورپ میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں قدیمی معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوگیا۔ نئے خیالات اور آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا۔ چنانچہ قدیم اور جدید کی لڑائی سے پیدا ہونے والے مسائل سے گھبرا کر امریکہ کے عیسائی پیشواؤں نے مختصر کتابچوں کا ایک سلسلہ جاری کیا جس میں بنیادی مسیحی عقائد کی طرف رجوع کرنے پر زور دیا گیا۔ اس کتابی سلسلے کا عنوان ''بنیادی اصول'' رکھا گیا۔ جس کی مناسبت سے اس تحریک کو بنیاد پرستی کہا جانے لگا۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی ان سے ملتے جلتے خیالات پائے جاتے ہیں انہیں بنیاد پرستی کہا جاتا ہے۔

Sanjh Lok Raj

ویسے تو بنیادی پرستی کا تعلق کسی خاص مذہب سے نہیں مگر یہ ایسا رویہ ہے۔ جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ چونکہ ساری دنیا میں اس رویے کا شکار سب سے پہلے مذہبی لوگ ہوتے ہیں اس لیے بنیاد پرستی کو مذہب سے جوڑ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ بنیاد پرستی سیاسی بھی ہوسکتی ہے۔ جیسے پاکستان 1947ء میں وجود میں آیا۔ ہم اپنے معاشی، سیاسی اور سماجی اصول قائداعظم ؒ کی تقاریر سے متعین کرتے ہیں۔ قائداعظم کا زمانہ کالونیل دور تھا۔ ساٹھ سال گذرنے کے بعد دنیا میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں جن میں معاشی طور پر سب سے اہم گلوبلائزیشن ہے۔ چند ملٹی نیشنل کمپنیوں نے پوری دنیا کی معیشت پر قبضہ کرلیا ہوا ہے۔ گلوبلائزیشن کے چیلنج کا سامنا جدید معاشی اصولوں کو اپنا کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم گلوبلائزیشن جیسے معاشی غلبے کا حل تلاش کرنے کے لیے قائداعظم کے فرمان کا سہارا لیں گے تو یہ سیاسی بنیاد پرستی ہے۔ دور جدید اور اس کی ترقی یافتہ میڈیکل سائنس کے علاج میسر ہونے کی موجودگی میں کسی بیماری کے لیے اگر دوسو سالہ پرانی کتاب میں درج نسخے کو برتر سمجھیں تو یہ بھی بنیاد پرستی ہے۔

اگر بنیاد پرستی کا مذہبی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات مان لینی چاہیے کہ ہر مذہب کسی خاص علاقے اور ایک خاص زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ ہر مذہب اپنی ابتداء سے تکمیل تک کے مراحل میں اپنے علاقے کے کلچر، روایات، طرز زندگی اور تاریخ کو اپنے اندر سمو کر آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح ایک مرحلے پر آ کر مخصوص عقائد، مخصوص رسومات طرز زندگی اور اخلاقیات کو اکٹھا کرکے ایک فکری اور سماجی نظام بنا کر مکمل ہوجاتا ہے یہ فکری سماجی نظام مذہب کا ماڈل قرار پاتا ہے۔ یہ ماڈل مذہب کی بنیاد ہوتا ہے۔ مذہب کے اس ماڈل کو دو طرح کی تبدیلیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک یا دو صدیاں گذر جانے کے بعد بدلے ہوئے حالات میں جب لوگوں کا رہن سہن بدل جاتا ہے۔ معیشت اور پیداوار کے طریقے تبدیل ہوجاتے ہیں۔ استعمال کی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ تو ایسے حالات میں لوگوں کی اکثریت بدلے ہوئے حالات میں خود کو ڈھال لیتی ہے۔ لیکن چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مذہب کے بنیادی ماڈل کو واپس لانے کا پرچار کرتے ہیں۔ اسے مذہب کو خالص بنانے کا نام دیا جاتا ہے۔ اسے احیاء کی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ اور ایسا ہر مذہب کے ساتھ ہوا ہے۔ جیسے سکھ مذہب میں خالصہ تحریک عیسائیوں

میں پیوریٹین ازم اور خود ہم میں خلافت راشدہ کے دور کو واپس لانے میں زندگی کے تمام مسائل کا حل سمجھا جاتا ہے۔ اسے بھی بنیاد پرستی میں شامل کرلیا گیا ہے۔ بنیاد پرست قوتیں چونکہ اقلیت میں ہوتی ہیں اور اکثریت اپنے موجود زمانے کے تقاضوں کے مطابق زندگی گذار رہی ہوتی ہے۔اس لیے بنیاد پرست قوتوں کو یقین ہوتا ہے کہ لوگ اپنی آزاد مرضی سے ماضی کی طرف لوٹنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ یہ سوچ بنیاد پرست قوتوں کو تشدد پر اُکساتی ہے۔ بنیادی پرست اپنی رائے کو مکمل اور حتمی سمجھتے ہوئے اس کو لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے جبر و تشدد کے راستے اختیار کرتے ہیں۔ بنیاد پرستوں کی نظر میں عوام کالانعام یعنی عام لوگ جانور ہوتے ہیں اس لیے انہیں ہانکنے کے لیے ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جمہوریت اور انسانیت کی نفی ہے۔ پاکستان میں بنیاد پرستی کی تحریک کو ضیاء الحق کے زمانے میں افغانستان جہاد کے لیے امریکی سرپرستی میں پروان چڑھایا گیا۔ بنیاد پرستی ہی کی وجہ سے عدم برداشت کا رویہ پروان چڑھتا ہے جدید سائنسی اور معاشی علوم جو کسی معاشرے کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں بنیاد پرستی ان کا راستہ روک کر قوم کے تخلیقی صنعت کاری کے عمل میں رکاوٹ ڈالتی ہے جس کی وجہ سے ہم غیر ملکی مصنوعات کی منڈی رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ جدید علوم کا رستہ روک کر قوم کو صنعتی ملکوں کی معاشی غلامی پر برقرار رکھتی ہے۔ اس لیے صنعتی ممالک ہم جیسے ممالک میں بنیاد پرستی کو فنڈ فراہم کرتے ہیں۔ بنیادی پرستی دراصل ماضی پرستی بھی ہے۔ موجودہ زمانے کو ماضی کے مطابق ڈھالنے کا کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے اس کا اندازہ آپ پاکستان کے حالات سے لگا سکتے ہیں۔ بنیاد پرستی محنت کش طبقے کے لیے تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے کیونکہ محنت کش طبقہ ہی معاشرے کو حرکت دینے والی قوت ہے۔ یعنی بائیں بازو کی قوت ہے۔

Sanjh Lok Raj

# سیکولرازم

سیکولرازم کا لفظ پہلی مرتبہ 1840ء میں ایک برطانوی ٹیچر سکالر ہولی اوک نے اس وقت استعمال کیا جب صنعتی انقلاب کے بعد جدید ریاست کی تشکیل کی جارہی تھی جس پر عیسائی پیشواؤں کا ریاست میں عمل دخل ختم ہوتا دیکھ کر چرچ نے ایک نظریاتی جنگ چھیڑ دی۔ جدید ریاست میں حکمران اور رعایا کا فرق ختم کر کے ریاست کی حدود میں بسنے والے تمام انسانوں کو برابر کا درجہ دیا جارہا تھا۔ ریاست کو انسانوں کی زندگی بہتر بنانے کا ذریعہ قرار دیا جارہا تھا۔ ہر شہری کی تعلیم روزگار، رہائش اور علاج کی ذمہ داری ریاست پر ڈالی جارہی تھی۔ قانون سازی کو عوام کی اکثریت کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے تابع کیا جارہا تھا۔ اس طرح ریاست پر عیسائی پیروں اور برطانوی جاگیرداری کا اجارہ ختم ہورہا تھا اور قانون سازی میں عوام کی مرضی شامل ہورہی تھی اس پر ایک نظریاتی بحث چھڑ گئی جس سے سیکولرازم کا نظریہ وجود میں آیا۔ سیکولرازم لاطینی لفظ سیکولم سے وجود میں آیا جس کا لفظی مطلب ہے دنیا۔ بحث یہ چھڑی کہ کیا ریاستی مسائل، آئین، بجٹ، انتخابات، معاشیات، بین الاقوامی تعلقات، قدرتی وسائل کی تقسیم اور ان کا استعمال، تعلیم اور ٹیکنالوجی کی ترقی وغیرہ کو جدید علم کی روشنی میں حل کیا جائے یا ان پر پیشوائیت سے رہنمائی لی جائے۔ اس پر رائے کے لحاظ سے معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ جاگیرداری اور پیشوائیت کے حامیوں کا خیال تھا کہ عوام کالانعام یعنی عوام جانور ہوتے ہیں اس لیے ان کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس رائے کا حامل ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ جبکہ دوسری طرف جدید سماجی سیاسی معاشی علوم کے ماہرین اور عوام تھے جن کا خیال تھا کہ عوام اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔

اگر ہم سیکولرازم کو نظریہ کے طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں انسانی سماج کے ارتقا کے تمام مراحل پر نظر ڈالنی ہوگی۔ ابتداء میں انسان شکار پر گذارا کرتا تھا۔ شکار کی تلاش میں اسے در بدر پھرنا پڑتا تھا۔ قدرت پر اس کا زور اتنا ہی کم تھا اور اس کی آزادی اتنی محدود تھی جیسے جنگلی جانور یا پرندے کی۔ انسان نے اپنی زندگی کے تجربوں سے بہت کچھ سیکھا۔ جب کبھی مرد شکار سے خالی گھر واپس لوٹتے تھے تو عورتیں ان کے لیے بیجوں سے کھانا تیار کرتی تھیں۔ بیج کے زمین پر گرنے اور اُگنے کے مشاہدے نے زراعت کی بنیاد رکھی۔ جب انسان نے زراعت سیکھ لی تو زراعت نے خانہ بدوش شکاری انسان کو دریاؤں کے کنارے بستیاں آباد کرنے پر مجبور کیا۔ لکڑی کے پانی پر تیرنے کے مشاہدے نے کشتی کے سفر کی ابتداء کی۔ زمین کاشت کرنے کی تیاری کے لیے پتھر کو ہل کے پھالے کے طور پر استعمال کیا گیا پھر دھات کا زمانہ شروع ہوا تو لوہے کے استعمال نے زراعت کو اور آسان بنا دیا۔ زمین کی زرخیزی کے لیے رسومات ادا کرتا کرتا انسان کھاد کا استعمال سیکھ گیا۔ جس طرح لکڑی کے پانی پر تیرنے کے اصول کی دریافت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسان بحری جہازوں تک پہنچا۔ بھاپ کی طاقت اور پہیہ کی ایجاد نے انسان کو طاقت بخشی۔ اس طرح پرندوں کو اڑتا دیکھ کر انسان میں اُڑنے کی خواہش نے ہوائی جہازوں اور راکٹ تک کی ایجاد کا سفر طے کروایا۔ سورج غرب ہونے کے بعد اندھیرے کا مقابلہ انسان نے بلب ایجاد کر کے کیا۔ کہتے ہیں کہ انسانی تہذیب کا آغاز زراعت کے دور سے ہوا۔ اور انسانی تاریخ کا سفر قدرت کے راز جان کر انہیں اپنی سہولت کے لیے استعمال کرنے کی ایجادات کا سفر ہے۔ آج ہمارے استعمال میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر زندگی ادھوری نظر آتی ہے۔ یہ ساری کی ساری اشیاء انسان نے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بنائی ہیں۔ اس طرح زندگی کے تجربوں نے اسے رہن سہن سکھایا ضرورت سے زائد زرعی پیداوار کے ذخیرے کی ملکیت اور وراثت کے سوال نے خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اجتماعی ملکیت کا دور ختم ہوگیا اور ذاتی ملکیت کے تحفظ کے لیے چوری کی روک تھام کے قوانین بنے اور سزائیں مقرر ہوئیں۔ پنچائیت جیسے ادارے قائم ہوئے۔ لوہار، ترکھان جیسے معاون کاشتکار کے پیشے پیدا ہوئے۔ گھریلو دستکاری، ضرورت کی اشیاء کا تبادلہ پھر زرعی اور دستکاری کی پیداوار کی قیمت کا تعین اور کرنسی کا آغاز

ہوا۔ پھر دور دراز تجارت شروع ہوئی۔ بھوکے قبیلوں نے خوشحال قبیلوں کے غلے کے ذخیرے لوٹنے کے لیے حملے کیے۔ دفاع کے لیے باقاعدہ فوج اور پھر فوج کی تنخواہ دینے کے لیے ٹیکس کا آغاز ہوا۔

بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان جادوٹونے سے شروع ہوکر جڑی بوٹیوں کے علاج سے گذرتا آج جدید مشینی میڈیکل سائنس تک پہنچ چکا ہے۔ انسانی اعضاء کی پیوندکاری ہورہی ہے۔ اگر ہم انسان کی سادہ سی ابتدائی زندگی سے آج تک کی پیچیدہ زندگی کا تجزیہ کریں تو انسان نے نہ صرف اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے چیزیں ایجاد کیں بلکہ پرامن، خوشحال اور منظّم زندگی گذارنے کے لیے ادارے بھی قائم کیے۔ ریاست، پارلیمنٹ، آئین، عدالتیں، سیاسی پارٹیاں، تجارتی نیٹ ورک تعلیمی ادارے، صحت عامہ کے ادارے، بنک وغیرہ تمام ادارے اپنے تجربات سے سیکھ کر زندگی کے میدان میں آگے بڑھتے ہوئے قائم کیے ہیں۔ آپ ایک لمحے کے لیے یہ سوچیں کہ اگر یہ تمام ادارے اور روزمرہ استعمال کی انسانی ایجادات ایک ہفتے کے لیے آپ کے پاس نہ ہوں تو زندگی کیسی ہو؟

اپنی زندگی کے تجربات سے سیکھ کر زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوشش کرنا ہی سیکولرازم ہے۔ ہرزمانے کی زندگی گذارنے کے طریقے اوراس وقت کے خیالات میں ایک مطابقت پائی جاتی ہے۔ ہر دور کی اشیاء اور خیالات آپس میں مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً ہل سے زمین کاشت کرنے اور کنویں سے پانی لگانے والے کسان کا تقدیر پر آج کے کسان کی نسبت زیادہ پختہ ایمان تھا جو زمین کی زرخیزی کا تجزیہ کروا کر کھادیں استعمال کرتا ہے زرعی مشینری اور تیارشدہ بیج استعمال کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ دسویں صدی کی اشیاء اور خیالات میں ایک مطابقت تھی۔ کوئی شخص اگر سولہویں صدی کی بدل گئی ہوئی اشیاء اور بدل گئے ہوئے خیالات کی آپس میں مطابقت تھی۔ اکیسویں صدی کے ذرائع آمدورفت، ذرائع مواصلات، علاج کی مشینی سہولتوں کو استعمال کرکے زندگی گذار رہا ہومگر خیالات کو آٹھویں صدی سے آگے نہ بڑھنے دینے پر بضد ہو وہ معاشرے کو جامد رکھنے کی کوشش کررہا ہے۔ جامد معاشرے ہمیشہ ترقی کررہے معاشروں کے غلام ہوتے ہیں۔ اگر ہم جدید اشیاء، جدید ادارے جدید طریقے، جدید سہولتوں کو جنہیں ہم اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں ظاہر کا

نام دیں اور وہ خیالات جو مسلسل آگے بڑھتے ہوئے معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات کو پور اکرنے کے لیے وقت کے ساتھ بدلتے چلے جاتے ہیں ان کو باطن کا نام دیں تو ظاہر اور باطن میں یکسانیت کا نام سیکولرازم ہے۔کوئی عالم دین یا عام شخص اگر جدید ریاست کے ادارے میں پارلیمانی نظام کی جدید سیاسی پارٹیاں بنا کر اسمبلی کا رکن منتخب ہوتا ہے اور خیالات کو قبائلی دور کے اداروں سے آگے نہ بڑھنے دینے پر بضد ہوتو وہ قوم کو دھوکا دے رہا ہے۔ظاہر اور باطن کا یہ تضاد معاشرے کے لیے ایسا ہی ہے جیسے ریل کی بوگیوں کے دونوں اطراف مخالف سمت میں دو انجن لگے ہوں اور بوگیوں کو مخالف سمت میں کھینچ رہے ہوں ایسی صورتِ حال میں ریل کتنا سفر طے کرے گی؟ آپ کو معلوم ہے۔لیکن اگر دونوں انجن بوگیوں کو ایک ہی سمت میں حرکت دیں؟

معاشرے کو جامد رکھنا ایک خاص طبقے کے لیے فائدہ مند ہے۔حکمران طبقہ خواہ جاگیرداروں پر مشتمل ہو یا پیروں پر۔خواہ صنعت کاروں پر مشتمل ہو یا فوجی آمروں پر۔ ہر صورت میں محنت کش طبقے کو غلام رکھنا چاہتا ہے۔اقلیتی طبقہ ہمیشہ اکثریتی طبقے پر اپنا اقتدار و تسلط قائم رکھنا چاہتا ہے۔اس لیے ہر ایسی سوچ جو محنت کش طبقے میں بہتر مستقبل کی خواہش پیدا کرے اس سوچ کو کفر قرار دینا محنت کش طبقے کو غلامی کے دلدل سے نہ نکلنے دینے کی سوچی سمجھی ترکیب ہے۔ ورنہ محنت کش طبقہ اپنی زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنی غلامی کو ختم کرسکتا ہے۔اپنے بچوں کا مستقبل روشن کرسکتا ہے۔یہی سیکولرازم ہے۔

Sanjh Lok Raj

# پُرانی جاگیرداری

ہماری اب تک کی تاریخ میں ہمیں دو قسم کی جاگیرداری سے واسطہ پڑا ہے۔ ایک برطانوی راج سے پہلے کی پرانی جاگیرداری جو سماج کے آگے بڑھنے کے تاریخی عمل کے ذریعے زرعی دور میں معاشرے کے اندر سے پیدا ہوئی۔ دوسری برطانوی دور کی جاگیرداری جو انگریزوں نے اپنے کالونیل مفادات کے پیش نظر مسلط کی۔ پنجاب میں آج ہمارا واسطہ جس جاگیرداری سے ہے وہ کالونیل دور کی مسلط کردہ جاگیرداری ہے۔

قدیم ہندوستان کے ابتدائی دور میں معاشرہ کا انحصار مویشیوں پر تھا جس کی وجہ سے زمین کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ امیری اور غریبی کا معیار مویشیوں کی تعداد تھی۔ چراگاہوں کی فراوانی تھی اور چراگاہوں کے لیے قبیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہتے تھے اس لیے انہیں کسی خاص قطعہ اراضی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ زراعت کے ابتدائی دور میں خانہ بدوش قبائل نے دریاؤں کے کنارے بستیاں آباد کیں تو مویشیوں کی نسبت زمین کی قدرو قیمت بڑھ گئی۔ زمین کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ برادری کے استعمال کی ہوتی تھی۔ اگر اس کا تبادلہ بھی کیا جاتا تو ایک برادری دوسری برادری کو زمین منتقل کرتی تھی۔

جن قبائل کی پیداوار ان کی ضرورتوں سے کم تھی وہ خوشحال قبیلے کی زائد پیداوار لوٹ لیتے تھے اس کام کے لیے لڑاکا نوجوانوں کی ضرورت تھی جس سے فوج کی ابتداء ہوئی۔ طاقتور اور بڑی تعداد میں فوج رکھنے والے قبیلے یا تو کمزور قبیلوں سے ان کی زائد پیداوار چھین لیتے تھے یا یہی پیداوار غیروں کے حملے سے ان کی حفاظت کرنے کے معاوضے کے طور پر وصول کر لیتے تھے۔ اس طرح فوجی لحاظ سے کمزور قبائل جب ایک بڑی تعداد میں طاقتور فوج رکھنے والے

قبیلے کی حفاظت میں آ گئے تو بادشاہت کی ابتداء ہوئی۔ اس طرح طاقتور قبیلوں نے کمزور قبیلوں پر غلہ کے ذخیرے لوٹنے کے لیے حملے کیے تو نہ صرف یہ کہ غلہ پر قبضہ کیا بلکہ لوگوں کو بھی غلام بنایا جس سے جنگجو قبائلی سردار بادشاہ بن گیا اور مفتوحہ قبیلے اس کی رعایا۔ ابتدائی بادشاہ فوج کے کمانڈر ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ فوج کو پالنے کے لیے رعایا قبیلے کی پیداوار میں سے حصہ وصول کیا کرتا تھا جس کے لیے وہ ہر علاقے پر کلکٹر مقرر کرتا۔ چونکہ مقبوضہ علاقہ بادشاہ کی ملکیت سمجھا جاتا تھا اور کلکٹر بادشاہ کا مقرر کردہ نمائندہ جو نہ صرف کاشکاروں کی پیداوار سے حصہ وصول کرتا بلکہ بیرونی حملے کے وقت انہی کاشتکاروں کو بادشاہ کی فوج میں بھی شامل کرتا تھا۔ اس لیے وہ ٹیکس نہ دینے والے یا فوج میں نہ جانے والے کی زمین ضبط کر لیتا تھا۔ چونکہ ہر بادشاہ اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی فکر میں رہتا تھا ور ہر مہم کے لیے انہی کلکٹروں کے ذریعے مزید ٹیکس لگاتا جس سے کاشتکار کے پاس اپنی زندگی گذارنے کے علاوہ کچھ نہیں بچتا تھا۔ یہی کلکٹر وقت کے ساتھ ساتھ جاگیردار بن گئے۔ جب بھی کوئی بادشاہ علاقے فتح کرتا تو یہ علاقے یا تو انہی پرانے جاگیرداروں کے پاس رہنے دیتا اگر انہوں نے قبضہ کروانے میں بادشاہ کی مدد کی ہوتی یا پھر اپنے وفادار ساتھیوں میں بطور انعام تقسیم کر دیتا۔ یہ علاقے جاگیریں کہلاتی تھیں۔ جب بادشاہ کا اقتدار مستحکم ہوجاتا تو یہ جاگیریں حکومت کے عہدے داروں اور امراء کو دی جانے لگیں اور اس کے علاوہ مذہبی پیشواؤں کو بھی دی جاتی تھیں۔

بادشاہ کی طرف سے جب کسی کو جاگیر دی جاتی تو اس کا باقاعدہ فرمان جاری ہوتا جس پر بادشاہ کی مہر لگی ہوتی تھی تاکہ اس کی قانونی حیثیت ہوجائے۔ یہ جاگیریں نہ مستقل ہوتی تھیں اور نہ موروثی۔ ان کا تعلق بادشاہ کی خوشنودی سے تھا۔ بادشاہ جب کسی کو جاگیر دیتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اس جاگیر سے مقررہ لگان وصول کرے۔

بادشاہت اور جاگیرداری ایک دوسرے کے سہارے پر کھڑی تھیں اور دونوں کا وجود کاشتکار کی پیدوار ہتھیا لینے پر قائم تھا۔ جاگیردار پیداوار ہتھیانے کے لیے جن لوگوں کو استعمال کرتا ان کا تعلق بھی کاشتکار طبقے سے تھا۔ بادشاہت اور جاگیرداری نظام کے تسلط کے تین ہزار سال کے دورانیے میں غلامی کی روایات نے جنم لیا اور ایسا کلچر پیدا ہوا جو بعد میں اس نظام کے تحفظ کا سب سے بڑا ہتھیار بن گیا۔ جن خیالات اور سوچوں کو ہزاروں سال میں حکمران

طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے پروان چڑھائے لوگوں کا ان کے مطابق ڈھل جانا قدرتی امر ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ کوئی شخص اگر جاگیردار ہو تب ہی جاگیردارانہ سوچ رکھے۔ ایسے معاشرے کا کوئی بھی شخص خود کو اور اپنے اردگرد کو حکمران طبقے کی آنکھ ہی سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ یہ سوچ خواہ ان کے اپنے لیے ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو۔

ہم جاگیرداری کلچر میں پروان چڑھائے گئے خیالات کو ایک ایسی مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو پنجاب کے ہر باشندے کی آنکھوں دیکھی ہے۔ بھینس ہمارے لیے دودھ کی پیداوار کا ذریعہ ہے۔ قدرت نے بھینس کو دودھ اس کے بچے کے لیے دیا ہے۔ اگرچہ اس دودھ پر قدرتی حق بھینس کے بچے کا ہے مگر ہم نے بھی اس کے حق میں سے حصہ وصول کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم بھینس کے بچے کو کھلا چھوڑ دیں گے۔ تو وہ سارا دودھ پی جائے گا۔ اس لیے ہمیں بھینس کے بچے کو رسی ڈال کر باندھنا پڑتا ہے۔ اور ہم اس کو صرف اتنا دودھ پینے کی اجازت دیتے ہیں جس سے وہ صرف زندہ رہ سکے۔ اور باقی دودھ ہمارے کام آئے۔ عربی زبان میں اس عمل کو استحصال کہتے ہیں۔ جاگیردار طبقہ جب ذرائع پیداوار پر قابض ہوتا ہے تو اسے اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے لوگوں کے حقوق کا استحصال کرنے کے لیے کوئی حکمت عملی اپنانی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے وہ ہر شخص کو زنجیر سے تو نہیں باندھ سکتا۔ اس کے لیے وہ مخصوص سوچوں اور خیالات کا جال پھیلاتا ہے۔ محنت کش طبقہ ایسی سوچوں کے جال میں پھنس کر خود بخود اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ جاگیردار بھی دوسرے تمام انسانوں کی طرح ایک انسان ہی ہوتا ہے مگر وہ خود کو دوسروں سے ممتاز کرنے کے لیے یہ سوچ پروان چڑھاتا ہے کہ حکمران کا خون نچلے درجے کے لوگوں سے کہیں بلند تر ہوتا ہے۔ حکمران پیدائشی ہوتا ہے اسے بنایا نہیں جاتا۔ اس طرح اعلیٰ اور گھٹیا نسل کی تفریق کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ اور نسلی سطح پر غلامی کو رواج دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عام لوگ خود کو سست بے کار جاہل اور اور زمین کا بوجھ سمجھ کر ذاتی بے قدری میں اپنی حیثیت کی پہچان کرنے لگتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام میں فرد کی شناخت اس کے خاندان سے ہوتی ہے نہ کہ اس کی صلاحیتوں سے خاندان کے تعلق سے جاگیردار کو قانونی حیثیت ملتی تھی اور اس کا جائیداد اور مراعات پر حق ہوتا تھا۔ اس کی بنیاد پر اسے حکومت کے اعلیٰ عہدے ملتے تھے۔ اور

خاص خاص قسم کے فرائض چند خاندانوں کے سپرد کر دیئے جاتے تھے۔ ان باتوں کیوجہ سے مراعات یافتہ خاندان اس کوشش میں رہتے کہ ان کا دائرہ وسیع نہ ہو بلکہ محدود رہے۔

قرونِ وسطیٰ میں عزت کا ذریعہ جنگ جویانہ اوصاف تھے علم و دانش نہیں جاگیردار طبقہ ایسی روایات اپناتا تھا جو انہیں دوسروں سے برتری دیتی تھیں۔ جیسے امراء کے خاندانوں میں شمشیر زنی، گھڑ سواری، نیزہ بازی اور شکار کھیلنا جس سے یہ عام لوگوں کو مرعوب کرتے تھے۔ جاگیرداروں کے بچوں کی پرورش خادموں کے ذریعے کی جاتی تھی جس سے ان میں ابتداء ہی سے یہ بات آجاتی تھی کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ضرورت نہیں ان کے لیے ہاتھ سے کام کرنا ذلت کا باعث تھا کیونکہ یہ کام ملازم کرتے تھے۔ معاشرے میں یہ خیال پروان چڑھایا جاتا تھا کہ عزت صرف جاگیردار کی ہوتی ہے اور عام لوگ اس کی خدمت کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جاگیردار اپنے وفاداروں پر عنایات کرتا اور عزت نہ کرنے والوں کو لوگوں کے سامنے بے عزت کر کے عبرت کا نشان بنا دیتا۔ لوگوں میں اطاعت اور تابعداری کے جذبات پیدا کیے جاتے تا کہ طبقاتی شعور پیدا نہ ہو۔

لوگ وفاداری کے جذبہ کی وجہ سے اپنے مالک اور آقا میں کسی قسم کی برائی نہیں دیکھتے تھے۔ جاگیردار طبقہ اپنی رعایا میں غداری کو بہت برا سمجھتا تھا مگر خود وفاداریاں بدلتا رہتا۔ روایتی طور پر جاگیردار خود کو قانون کا نافذ کرنے والا سمجھتا تھا اس لیے وہ اسے اپنی بے عزتی سمجھتا تھا کہ قانون کی پابندی کی جائے۔ جاگیردار ہر معاملے میں اپنا علم مکمل سمجھتا تھا اور اپنی رائے کو حتمی۔ اس لیے وہ کسی دوسرے کی رائے کو احترام کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ اختلاف رائے کو ذاتی دشمنی سمجھتا۔ پاکستان کی تمام سیاسی پارٹیوں میں آج بھی جاگیرداری کلچر قائم رکھا گیا ہے اس لیے یہ پارٹیاں کسی نظریہ یا پروگرام سے متفق لوگوں کی تنظیم نہیں ہیں بلکہ ایک شخصیت کے گرد وفاداروں کا بے ترتیب ہجوم ہیں۔ جاگیردار کی سب سے بڑی کمزوری خوشامد پسندی تھی۔ خوشامد کرنے والا انہیں بہت اچھا لگتا تھا اور تنقید کرنے والا دشمن آج پاکستان میں جاگیرداروں کے سیاسی کردار کی وجہ سے سیاست کو منافقت سمجھا جانے لگا ہے۔ ورنہ سیاست کے بغیر معاشرے میں تبدیلی ممکن نہیں۔

Sanjh Lok Raj

# کالونیل جاگیرداری

کالونیل کا لفظ ہم پاکستانیوں کے لیے اجنبی بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ اجنبی اس لیے کہ نصاب کی کسی کتاب میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ اور گمراہ کن اس لیے کہ کالونی کا لفظی مطلب ہے نئی بستی بسانا۔ یورپیوں نے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں نئی بستیاں آباد کیں اور وہیں کے ہو رہے مگر ہندوستان میں تو وہ دولت لوٹنے آئے تھے۔ اس لوٹ کو مستقل جاری رکھنے کے لیے وہ ایسی پالیسیاں ترتیب دیتے رہے۔ جس کے نتیجے میں آزادی کے 61 سال بعد تک بھی وہ بڑی کامیابی سے ہمیں لوٹ رہے ہیں۔ ہمارے ملک پر ان کا غاصبانہ قبضہ تھا۔ یہاں کے سارے وسائل ان کے قبضے میں تھے لوگوں کو انہوں نے غلام بنا رکھا تھا۔ بلکہ لوگوں کو غلام رکھنے کے مستقل ادارے تشکیل دیئے۔ اس غاصبانہ قبضہ کو کالونی نہیں کہا جاسکتا سامراجی تسلط کہا جاسکتا ہے۔ البتہ تاریخ میں اس لفظ کا استعمال اتنا عام ہے کہ یہ لفظ انٹرنیشنل سطح پر ایک اصطلاح بن چکا ہے۔ اس لیے برطانوی دور کی ہر وہ پالیسی جو برطانوی غاصبوں نے ہمیں مستقل غلام معاشی طور پر پسماندہ اور مفلوج رکھنے کے لیے مسلط کی اسے کالونیل پالیسی کہتے ہیں۔

جب برطانیہ نے ہندوستان پر قبضے کا آغاز کیا اس وقت معاشی لحاظ سے برطانیہ اور ہندوستان دونوں زرعی ملک تھے۔ برطانوی تاجر یہاں سے دستکاروں کا بنایا ہوا سامان خرید کر لے جاتے اور اس کے بدلے میں سونا اور چاندی دے جاتے۔ اس زمانہ میں دولت کا بہاؤ برطانیہ سے ہندوستان کی طرف تھا۔ لیکن 1757ء میں برطانیہ نے اپنی فوجی برتری کی وجہ سے بنگال بہار اور اڑیسہ پر قبضہ کرلیا تو مقبوضہ آبادی سے ٹیکس وصول کرکے برطانیہ بھیجنا



Sanjh Lok Raj

شروع کردیا۔ 1757ء سے 1807ء تک برطانوی پارلیمنٹ میں ہونے والی تقریروں کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ارب پاؤنڈ ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہو چکے تھے۔ دولت کا بہاؤ اب ہندوستان سے برطانیہ کی طرف ہوگیا۔ اس طرح ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت اور برطانیہ میں پہلے سے موجود ایجادات نے برطانیہ میں صنعتی انقلاب برپا کردیا۔ صنعتی انقلاب نے دو نئے طبقوں سرمایہ دار اور صنعتی مزدور طبقے کو جنم دیا۔

برطانوی سرمایہ داروں نے اب صنعتی نظام کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے تحت زرعی معاشرے کے اداروں کو تبدیل کرنے کا سوچا۔ کیونکہ صنعتی معاشرت اب زرعی اداروں کی موجودگی میں پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ صنعت کاروں نے سیاسی پارٹیاں قائم کیں۔ عام آدمی کو ووٹ کا حق دلانے کی جدوجہد کی۔ الیکشن جیت کر پارلیمنٹ میں آئے۔ سب سے پہلا کام جو سرمایہ دار طبقے نے کیا وہ یہ تھا کہ برطانیہ کو زراعت پر جامد رکھنے والی قوت یعنی جاگیردار طبقہ کا خاتمہ کردیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی مقبوضات کو زراعت پر جامد رکھ کر انہیں اپنی مصنوعات کی منڈی رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ یعنی یہاں کی آبادی زراعت سے جو کچھ دولت کمائے وہ برطانوی مصنوعات خرید کر برطانیہ منتقل کردے۔ اس پالیسی پر عملدرآمد کے لیے انہوں نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ہندوستان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ختم کرکے اُسے براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت کردیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے سوسالہ دورِ اقتدار میں خود کو صرف ٹیکس اکٹھا کرنے تک محدود رکھا۔ ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ کیا۔ لیکن ہندوستانی تہذیب کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ لیکن اب برسرِ اقتدار برطانوی سرمایہ داروں کی پالیسیاں اس خطے میں یکسر بدل گئی تھیں۔

برطانوی سامراجیوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی مقبوضات کو زراعت پر جامد کریں گے تاکہ یہ مقبوضات خام مال پیدا کرنے تک محدود رہیں اور برطانوی مصنوعات کی منڈی رہیں تاکہ انہیں مستقل پسماندہ رکھ کر برطانیہ مستقل ترقی یافتہ اور خوشحال رہے۔ اس کام کے لیے اب انہوں نے ایک مستقل سیاسی اور معاشی ڈھانچہ تشکیل دیا۔

ہندوستان پہلے ہی بڑی آبادی والا زرعی ملک تھا۔ یہاں دریاؤں پر ہیڈ ورکس تعمیر کرکے نہروں کا جال بچھایا گیا اس طرح بہت ساری زمین کو قابلِ کاشت بنایا گیا پھر یہ زمین



Sanjh Lok Raj

جاگیر کی صورت میں ان لوگوں کو عنایت کی گئی جن کی وفاداری وہ 1857ء کی جنگ آزادی میں آزما چکے تھے۔ یہ زمین کسانوں میں بھی تقسیم کی گئی مگر قیمت لے کر۔ یہ جاگیردار آگے چل کر برطانوی سامراج کے سیاسی اور معاشی مفادات کے مستقل، نسل در نسل محافظ بننے والے تھے۔ یہ کالونیل جاگیرداری کہلاتی ہے۔ اور یہ پرانی جاگیرداری سے یکسر مختلف تھی کیونکہ پرانی جاگیرداری زرعی معاشرے کا خودرو ادارہ تھی مگر کالونیل جاگیرداری ایک منصوبہ بندی کے تحت ہمیں زراعت پر جامد رکھنے کے لیے مسلط کی گئی۔ اس طرح سامراجیوں نے آئندہ کئی صدیوں کے لیے اس خطے کی معاشی ترقی کو اپنے مفادات کے تابع کرلیا۔

برطانوی سامراج نے کالونیل جاگیرداروں کا طبقہ ہی پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں ایک متبادل سیاسی قوت اور دوسرے درجے کے حکمران کے طور پر پروان چڑھایا۔ کروڑوں عوام کو چند جاگیرداروں کی رعایا بنادیا گیا اور پولیس کا نظام قائم کرکے تھانے کو رعایا پر جاگیردار کا تسلط قائم رکھنے کے آلہ بنادیا گیا۔ اس کالونیل جاگیرداری کا تسلط قائم رکھنے کے لیے عدلیہ کو پولیس کی تفتیش کا محتاج اور انتظامیہ کے ماتحت رکھا گیا۔ ایسی تعلیم متعارف کروائی گئی جس کو محض حرف شناسی کہا جاسکتا ہے۔ یہ تعلیمی نظام پیداواری عمل سے نہیں جوڑا گیا بلکہ یہ تعلیمی نظام کھپت کے عمل سے جوڑا گیا۔

پھر ایسی فوج منظم کی گئی جو کالونیل جاگیرداری، اس کی محافظ پولیس اس کا معاون عدالتی نظام، اس کی بنیادیں مضبوط کرنے والا تعلیمی نظام ان سب پر نگران کے طور پر کام کرے۔ تمام ریاستی ادارے کالونیل جاگیرداری کو مستحکم کرنے کے لیے بنائے گئے اور کالونیل جاگیرداری ہمیں زراعت پر جامد رکھنے کے لیے بنائی گئی۔ اب اگر کوئی سوال کرے کہ آزادی کے 61 سال بعد تک بھی

1- پاکستان میں جمہوریت کیوں مستحکم نہیں ہوئی؟
2- پاکستان کی کوئی پارلیمنٹ آج تک بااختیار اور خودمختار کیوں نہیں ہوئی؟
3- سیاسی جماعتیں کسی منشور پر متفق لوگوں کی تنظیم کی بجائے کسی شخصیت اور اس کے خاندان کے وفاداروں کا ہجوم کیوں ہیں؟
4- عدلیہ آج تک آزاد کیوں نہیں ہوسکی؟



Sanjh Lok Raj

5- پاکستان آزادی کے 61 سال بعد بھی معاشی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا کیوں نہیں ہوسکا؟

6- ہر سال پاکستان کو 50 ارب سے زیادہ تجارتی خسارہ کیوں ہوجاتا ہے؟ کوئی ملک مسلسل تجارتی خسارہ اور اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے اپنی خودمختاری کا سودا کرکے حاصل کیے گئے امریکی قرضے سے کب تک چل سکتا ہے؟

7- 90 فیصد پاکستانیوں کو تعلیم اور علاج کی سہولتوں سے محروم رکھ کر اربوں روپے اسلحہ اور بارود کی خریداری پر کیوں خرچ کیا جاتا ہے؟

8- بیوروکریسی ہی پاکستان کے 16 کروڑ عوام کے لیے پالیسیاں کیوں بنائی ہے؟

9- کیا ملک کو زراعت پر جامد رکھ کر بیروزگاری کی بڑھتی ہوئی شرح کو روکا جاسکتا ہے؟

10- کیا غیرملکی سرمایہ کاری ہماری معاشی زندگی کا آخری فیصلہ ہے؟

یہ اور اس قسم کے کئی اور سوالوں کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے کہ ہم نے برطانوی سامراج سے کالونیل جاگیرداری اور اس پر مقرر کیے گئے محافظ ادارے یعنی پولیس اور بیوروکریسی، اس کی معاون عدالتیں، فوج ایک پورا کالونیل سسٹم ورثہ میں لیا ہے۔

آج بھی جب کالونیل جاگیرداری کمزور پڑنے لگتی ہے تو فوج مارشل لاء لگا کر اس کو مضبوط کردیتی ہے۔ اب تک ان جاگیرداروں کو 42 ارب روپے کے قرض فوجی حکومتوں نے معاف کیے ہیں۔

آج بھی ہر حکومت زرعی ترقی پر زور دیتی ہے۔ ایک کھوکھے والا ٹیکس ادا کرتا ہے۔ مگر جاگیرداروں کی آمدن پر کوئی ٹیکس نہیں۔ زرعی ٹیکس کی تجویز آتی ہے تو پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے تمام جاگیردار متفق ہوکر اسے مسترد کردیتے ہیں وہ سیاسی پارٹیاں جو پارلیمنٹ کے باہر آپ کو ایک دوسرے کی دشمن نظر آتی ہیں۔ زرعی ٹیکس کے خلاف متفق ہوتی ہیں۔ آج پاکستان کے دنیا میں معاشی طور پر سب سے پیچھے رہ جانے حتی کہ بنگلہ دیش سے بھی پیچھے رہ جانے کی وجہ کالونیل جاگیرداری ہے۔ جب تک کالونیل جاگیرداری کا خاتمہ نہیں کیا جاتا تب تک ہمارا معاشرہ جامد رہے گا۔ ہم غیرملکی مصنوعات کی منڈی رہیں گے۔

ایک کالونیل جاگیرداری ہے دوسرا اس جاگیرداری کا کلچر ہے۔



Sanjh Lok Raj

یہ کلچر ہے اقتدار کی خاطر وفاداریاں تبدیل کرنا اور شرم محسوس نہ کرنا اپنی رائے کو آخری اور حتمی سمجھنا اور اختلاف رائے کو ذاتی دشمنی خیال کرنا۔ روشن خیالی اور جدید سائنس کو بلکہ تعلیم کو اپنا دشمن خیال کر کے اس کی مخالفت کرنا۔ ذات پات جیسے دقیانوسی خیالات اور سامراجیوں کی وفاداری کے عوض ملی ہوئی جاگیر کو خدا کا تحفہ ثابت کرنے والے مذہبی خیالات کی ترویج کرنا۔ اپنے بنیادی انسانی حقوق یعنی تعلیم، روزگار اور علاج کا حق مانگنے والے کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھنا اور بنیادی انسانی حقوق کی تحریکوں کو مذہب دشمن قرار دے کر کچلنا وغیرہ یہ جاگیرداری کلچر کی عکاسی ہے۔

Sanjh Lok Raj

# سرمایہ داری

روزمرہ بول چال میں ہم چونکہ ہر قیمتی چیز کو خواہ وہ زمین ہو۔ زیورات یا نقدی اُسے سرمایہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اُسکی محبت میری زندگی کا سرمایہ ہے اس لیے سرمایہ کا اصل مفہوم ہماری نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ سرمایہ کا لفظ ایک معاشی اصطلاح ہے جس کو دراصل کیپیٹل سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن اگر سرمایہ اور دولت کا موازنہ کیا جائے تو پھر سرمایہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ سرمایہ دار اور دولت مند میں کیا فرق ہے۔ کیونکہ سرمایہ داری ایک سیاسی اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ اسی میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کا فرق بھی پوشیدہ ہے۔

دو آدمیوں کے پاس ایک ایک کروڑ روپیہ ہے۔ ایک آدمی اُس ایک کروڑ روپیہ سے بڑے شہر میں کوٹھی خرید لیتا ہے اُس میں رہنے کے لیے۔ دوسرا آدمی کسی گاؤں میں پنسل بنانے کا ایک کارخانہ لگا لیتا ہے۔ تاکہ گاؤں کے لوگوں کو سستی مزدوری پر رکھ کر پنسلیں بنائے اور مارکیٹ میں فروخت کر کے مزید روپیہ کمائے۔ پہلے شخص کی کوٹھی اُس کی دولت اور پونجی ہے جبکہ دوسرے آدمی کی دولت اب سرمایہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دولت جو مزید دولت کمانے کے لیے کسی ایسے کام میں لگائی جائے جس سے کچھ لوگوں کو روزگار ملے۔ کوئی پیداوار ہو ایسی دولت کو سرمایہ کہتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں صنعتی کارخانہ قائم ہوتے ہی اپنا سرمایہ بہت جلد اکٹھا کر لیتا ہے۔ بہت جلد منافع کمانے لگتا ہے تاکہ دوسرا کارخانہ بھی لگایا جاسکے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ابتدائی صنعت کاری کے لیے سرمایہ کہاں سے آیا تھا؟ ظاہر ہے ابتدائی صنعت کاری یورپ میں

ہوئی۔ بے شمار ایجادات سرد خانوں میں پڑی تھیں۔ لیکن تجارت کے نام پر کالونیوں سے چڑھائیوں، ڈکیتیوں لوٹ کھسوٹ کے ذریعے کمائی ہوئی دولت نے ان ایجادات کو صنعت کاری میں تبدیل کر دیا۔

1770ء میں ہندوستان میں جب بھوک کے ہاتھوں ہزاروں بنگالی بہاری اُڑیسہ کے لوگ جب قحط کی وجہ سے موت کی نیند سو گئے تو کیا اس زمانے میں غلہ پیدا ہونا بند ہو گیا تھا؟ جواب ہے نہیں۔ حالانکہ اعداد و شمار تو یہ بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں فصلیں اچھی ہوئی تھیں اور غلہ کے ذخیرے کم نہیں تھے تو آخر یہ قحط کیوں تھا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز تاجر پوری فصل خرید لیتے تھے اور بعد میں من مانا منافع لے کر یہی غلہ ان غریب دیسیوں میں بیچ دیتے تھے۔ اور غریب ہندوستانی اپنی غریبی کی وجہ سے ان بڑھی ہوئی قیمتوں پر غلہ خریدنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ تھی کالونیل تجارت جس نے یورپ میں دولت کے ڈھیر لگا دیئے۔

سوال یہ ہے کہ برطانیہ میں لیورپول اور مانچسٹر جو معمولی قصبوں کی حیثیت رکھتے تھے کیوں کر اتنے بڑے اور عظیم الشان شہر بن گئے؟ کیا چیز ان کی ہمیشہ جاری رہنے والی صنعت کا پیٹ بھرتی اور ان کی تیزی سے مسلسل بڑھتی ہوئی دولت و خوشحالی کا موجب ہوتی ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ صنعتی ممالک دنیا کی ساری دولت دور بیٹھے ہی سمیٹ رہے ہیں اور زرعی ممالک غریب سے غریب تر ہو گئے ہیں؟ اس کے لیے سرمایہ داری کے ارتقا اور پھیلاؤ کے بارے میں چند ایسی بنیادی اصطلاحات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو مشینی پیداوار کے شروع ہوتے ہی اخبارات اور معاشیات کے علم کا حصہ بنیں۔

## 1- خام مال:

آپ کو ایک میز کی ضرورت ہے۔ آپ بڑھئی کے پاس جاتے ہیں وہ آپ سے کہتا ہے کہ میز ایک ہزار روپے میں ملے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ نہیں آٹھ سو روپے لے لیں۔ جس پر وہ آپ کو بتاتا ہے کہ لکڑی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ کافی وقت لگے گا تین چار دن میں تیار ہو گا۔ بجلی کبھی آتی ہے کبھی نہیں آتی۔ آخر آپ مان جاتے ہیں کہ چلو ایک ہزار میں میز بنا دو۔ پھر وہ کہتا ہے کہ یہ پیسے پالش کے بغیر ہیں۔ پالش کی رقم اور مزدوری الگ ہو گی۔ اس گفتگو میں بہت سی چیزوں کا ذکر ہے لیکن اُن تمام چیزوں میں خام مال ایک ہی چیز ہے، وہ ہے لکڑی۔

ایک سو روپے کی لکڑی اور بڑھئی کی محنت نے اس کی قدر و قیمت ایک ہزار روپے بنادی۔ ہر صنعت کو تیار شدہ مال پیدا کرنے کے لیے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے کپڑے کی صنعت کو کپاس کی۔ ٹریکٹر سازی کی صنعت کو لوہے کی چینی بنانے کے لیے گنے کی۔ کاسمیٹکس بنانے کے لیے کیمیکلز کی اور ٹیلیویژن بنانے کے لیے الیکٹرانکس کے سامان کے۔

## 2- مزدور:

کوئی سرمایہ نفع نہیں کما سکتا تاوقتیکہ محنت کشوں کی محنت شامل ہو کر کسی خام مال کو تیار شدہ مال میں تبدیل کر کے نفع بخش نہ بنادے۔ اس لیے سرمائے کی مہم کے لیے محنت کشوں کی معقول تعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزدور ہی اپنی محنت سے خام مال کو تیار شدہ مال کی شکل دیتا ہے۔ یعنی اگر وہ 50 روپے کی کپاس کو 500 روپے کے کپڑے میں تبدیل کرتا ہے تو اس میں توانائی اور خام مال کے علاوہ اس کی محنت بھی شامل ہے۔ اس کی محنت ہی سرمایہ دار کے لیے منافع پیدا کرتی ہے۔ ایک مزدور اگر ایک کارخانے میں ایک دن میں ایک ہزار روپے کی جنس پیدا کرتا ہے اور بدلے میں ایک سو روپے مزدوری لیتا ہے اور ایک سو روپے لاگت ہے تو باقی 800 روپے منافع وہ سرمایہ دار کے لیے پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک لاکھ مزدور ایک ماہ میں سرمایہ دار کے لیے کتنا منافع پیدا کریں گے؟

## 3- فاضل پیداوار:

زرعی معاشرے میں ضروریاتِ زندگی کی اشیاء دستکاری سے حاصل کی جاتی تھیں یعنی ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں۔ اس لیے یہ اشیاء اتنی ہی مقدار میں بنائی جاتی تھیں جتنی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر مشینوں نے تو پیداوار کے ڈھیر لگا دیئے اور لوگوں کو ضروریات اور قوتِ خرید سے کہیں زیادہ پیداوار کی۔ مثلاً ٹیکسٹائل کی صنعت نے برطانیہ میں جنم لیا۔ پہلے وہاں کپڑا کھڈیوں پر بُنا جاتا تھا۔ جب صنعت لگ گئی تو ہزاروں کلومیٹر کپڑا بُنا جانے گا۔ اگر برطانیہ کے کارخانے ایک سال میں ایک ہزار کلو میٹر کپڑا بُنتے ہیں اور برطانیہ کی آبادی کی ضرورت یا قوتِ خرید 400 کلو میٹر ہے تو بقایا 600 کلومیٹر کپڑا فاضل پیداوار کہلاتی ہے۔ یہ فاضل پیداوار ہی ہے جس کی کھپت کے مسئلے نے نہ صرف صنعتی ممالک میں بلکہ پوری دنیا کے سیاسی



SanjhLokRaj

نظام میں تبدیلیاں کر دیں۔ کس طرح اس فاضل پیداوار نے صنعتی ملکوں کو سامراج بنایا؟ کس طرح ہمارے جیسے ملکوں کو زراعت پر جامد کر کے صنعتی ممالک کی فاضل پیداوار کی کھپت کی منڈی رکھا گیا؟ کالونیل طاقتوں نے سرمایہ داری کے بعد کس طرح مقبوضہ ممالک میں ایسا ریاستی ڈھانچہ تشکیل دیا جو فاضل پیداوار کی کھپت کا صدیوں محافظ رہے؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے ہی میں آپ کو اپنے ملک کے سیاسی و معاشی نظام اور اس پر قابض طبقے کی سمجھ آئے گی۔

## 4- مارکیٹ یا منڈی:

آپ دیکھیں کہ اگر کسی جگہ پر دوکانیں اور بازار مال سے بھرے پڑے ہوں لیکن لوگوں کی جیب میں اسے خریدنے کے لیے پیسہ نہ ہو تو اس مارکیٹ کا کیا حال ہوگا؟ اس لیے مارکیٹ کسی جگہ مال سے بھری ہوئی دوکانوں اور بازاروں کا نام نہیں بلکہ قوتِ خرید رکھنے والی آبادی کا نام ہے۔ صنعتی ملکوں کی فاضل پیداوار کی کھپت کی ضرورت نے اپنے ملک سے باہر منڈیاں تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ اپنی ملکی منڈی کو غیر ملکی مصنوعات سے بچا کر اپنی صنعتی ترقی کو جاری رکھنے کی مجبوری سے ملکوں کے بارڈر وجود میں آئے۔ یہ بارڈر دراصل منڈی کے بارڈر کہلاتے ہیں۔ پاسپورٹ ویزا اس کے بعد آئے۔ ورنہ اس سے قبل کوئی شخص دنیا میں کہیں بھی جاسکتا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم صنعتی ملکوں کے درمیان منڈی کی چھینا جھپٹی کے لیے ہوئی۔ مارکیٹ اکانومی اور گلوبلائزیشن بھی فاضل پیداوار کی کھپت کے لیے منڈی کو وسیع کرنے اور کھپت پر ریاستی کنٹرول ختم کرنے کا پروگرام ہے۔

## 5- تجارتی خسارہ:

یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ بارڈر دراصل کسی ملکی منڈی کی چار دیواری ہوتا ہے۔ اگر دو صنعتی ممالک کے درمیان مصنوعات کی تجارت ہو اور وہ دونوں مثال کے طور پر ایک ایک ارب کی مصنوعات ایک دوسرے کو لے دے رہے ہیں تو اسے کہتے ہیں کہ ان کے درمیان تجارتی توازن ہے لیکن اگر ایک ارب کا مال کسی صنعتی ملک سے کسی زرعی ملک کی طرف جا رہا ہو اور زرعی ملک سے محض ایک ارب روپیہ نقدی، صنعتی ملک کو منتقل ہو رہا ہو تو اسے تجارتی خسارہ کہتے ہیں۔ پاکستان جیسے جس کسی ملک کو اگر ہر سال 50 ارب کا تجارتی خسارہ ہو اور وہ

خسارہ پورا کرنے کے لیے ہر سال قرض لے کر اپنا ملک چلائے تو وہاں کیسا سیاسی نظام ہوگا۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

## 6- نکاسی سرمایہ:

ظاہر ہے آج کل کی زندگی کا انحصار بے شمار مصنوعات پر ہے۔ صبح اُٹھتے ہی ٹوتھ پیسٹ سے لے کر سفر کے لیے ہوئی جہاز تک ہر چیز۔ حتی کہ زراعت میں مشینری، کھادیں، بیج، کیڑے مار ادویات بھی صنعتی پیداوار ہیں۔ کسی ملک کے حکمرانوں اور پالیسی سازوں کا اس بات پر بضد رہنا کہ ملک صرف زراعت میں ترقی کرے گا۔ ملک کو غیر ملکی مصنوعات کی منڈی رکھنے کی کوشش ہے۔ اس طرح لوگ جو کچھ زراعت سے کماتے ہیں وہ مصنوعات خرید کر دوسرے ملکوں کو بھیج دیتے ہیں اسے نکاسی سرمایہ کہتے ہیں۔

سمجھا یہ جاتا تھا کہ تاریخ کے سفر میں ایسا ہوا کہ جب کسی ملک میں صنعتیں لگی ہیں تو صنعت کار طبقہ نے سیاسی قوت بن کر اقتدار پر قبضہ کیا ہے اور زرعی نظام معیشت، اس کے کلچر اور اس کی سیاسی قوت یعنی جاگیرداروں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ مگر اب عالمی سطح پر ہمارے جیسے ممالک میں جنہیں سرمایہ داری کی راہ پر چلنے کی اجازت نہیں۔ ان ممالک میں جاگیرداری کا خاتمہ محنت کش طبقے میں سے قیادت پیدا کر کے کیا جائے گا۔

Sanjh Lok Raj

# ریاست

پچھلے دوسالوں سے پاکستان کے وکلاء نے آزاد عدلیہ کی ایک تحریک چلا رکھی ہے۔ جس کے بارے میں میڈیا نے ریاست اور اس کے تمام اداروں کے متعلق لوگوں میں بیداری پیدا کی ہے۔ اب وکلاء کی اس تحریک میں سیاسی پارٹیاں اور عوام بھی شامل ہوگئے ہیں۔ فرض کریں کہ عوامی مطالبے کے نتیجے میں عدلیہ آزاد ہوجاتی ہے۔ ایسی عدلیہ جس کو عوام آزاد کروائیں گے اس کا کردار کیا ہوگا؟ یقیناً عوامی مطالبے کے نتیجے میں آزاد کروائی گئی عدلیہ اس عدلیہ سے یکسر مختلف ہوگی جو کالونیل انتظامیہ کے معاون کے طور پر متعارف کروائی گئی تھی۔ یہ تو صرف ایک ادارے کا محض کردار بدلنے کا مطالبہ ہے۔ ادارے بذاتِ خود لوگوں کے مطالبے اور ان کی جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ ریاست بھی اِسی طرح کا ایک ادارہ ہے جو سرمایہ داری کی سیاسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قائم ہوا چونکہ ہمارا خطہ ابھی بادشاہت ہی کے زیرِ انتظام تھا کہ انگریزوں نے اس پر قبضہ کرکے ایک کالونیل ریاستی ڈھانچہ مسلط کردیا اس لیے ہم نے اپنے تجربے کی وجہ سے ریاست کے بارے میں قیاس قائم کیا ہوا ہے۔ عام آدمی جو پولیٹیکل سائنس کا طالب علم نہیں وہ تو بس کسی ملک یا اس کی حکومت ہی کو ریاست سمجھتا ہے ویسے بھی ہمارے ہاں راجاؤں مہاراجاؤں کے زیرِ انتظام علاقوں کو ریاست کہا جاتا ہے۔ یا پھر کتابوں میں یونان کی شہری ریاستوں کا ذکر ہے جو قبل مسیح قائم ہوئیں آج کے زمانے میں یہ شہری ریاستیں ایک شہر کی بلدیہ کے برابر تھیں۔ مگر ریاست جسے ہم جدید ریاست کہتے ہیں یہ تین برابر کے خودمختار اداروں کا مجموعہ ہے۔

سماجی سائنس کی سب سے بڑی دریافت یہ سماجی قانون ہے کہ ہر معاشی نظام ایک

خاص کلچر اور خاص سیاسی نظام کو جنم دیتا ہے۔ زرعی نظام معیشت نے زرعی کلچر کو جنم دیا۔ زرعی معیشت کی سیاسی قوت جاگیردار طبقہ ہوتا ہے اور اس کا سیاسی نظام بادشاہت، جبکہ صنعتی نظام معیشت کا اپنا ایک خاص کلچر ہے اور سرمایہ دار اس نظام معیشت کی سیاسی قوت صنعتی نظام معیشت کا سیاسی نظام جمہوریت ہے۔ بادشاہت سے جمہوریت تک کے سفر میں سلطنت کیسے ریاست میں تبدیلی ہوگئی۔ اس تبدیلی کے عمل میں ریاست کا ارتقا سمجھ میں آئے گا۔

سلطنت:

1- بادشاہ کو سلطان بھی کہتے ہیں۔ دنیا کے زیادہ تر ممالک پر بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔ وہ سارا علاقہ جس پر سلاطین کی حکومت ہوتی سلطنت کہلاتا تھا۔ سلطنت کے باشندے رعایا کہلاتے ہیں۔

2- قدیمی بادشاہ اپنے اقتدار کا جواز خود کو سورج یا چاند کی اولاد بتا کر۔ خدا کے اوتار یا خدا کی طرف سے اس منصب پر فائز کیا جانا بتاتے۔ مسلمان بادشاہ جامع مسجدوں میں اپنے نام کا خطبہ پڑھواتے۔ عوام کو بتایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاکم وقت کی اطاعت میں ہے۔ یہاں تک کہ خطبہ میں سلطان کو زمین پر خدا کا سایہ قرار دیا جاتا (السلطان ظل اللہ)

3- بادشاہ اگرچہ مطلق العنان ہوتا مگر سلطنت کے ہر علاقے پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے وفادار لوگوں میں سے حاکم مقرر کرتا۔ جو علاقے کی پیداوار پر کسانوں سے ٹیکس وصول کرتے۔ جنگ میں بادشاہ کی مدد کے لئے فوج پالتے۔ بوقت جنگ بادشاہ کے خزانے میں عوام کی زندگی بھر کی جمع پونجی چھین کر جمع کروا دیتے اور کہتے کہ اس کے عوض انہیں بیرونی حملہ آوروں سے تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

4- بادشاہ کے قتل ہو جانے یا بیرونی حملہ آور سے شکست کھانے یا کسی معزول بادشاہ کی اولاد میں سے تخت کے دعویدار کے قبضے کے علاوہ طبعی موت ہی بادشاہت تبدیل کرنے کا ذریعہ تھی۔ بادشاہ کسی ایسی وجہ سے تبدیل ہو جاتا مگر درباری تبدیل نہیں ہوتے تھے کیونکہ یہ فوری طور پر نئے بادشاہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلا دیتے اور نیا بادشاہ بھی انہی پرانے درباریوں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی حکومت کی گرفت پورے



Sanjh Lok Raj

علاقے پر پھیلا دیتا۔

5- بادشاہ خود ہی سب سے بڑا مصنف ہوتا۔مگر دور دراز علاقوں پر اپنی طرف سے قاضی مقرر کرتا۔قاضی بادشاہ کے ذاتی ملازم ہوا کرتے تھےاور بادشاہ کی مرضی کو قانون کا نام دے کر سلطنت کے باشندوں پر بادشاہ کے اقتدار کو مضبوط بناتے۔

6- بادشاہ اپنے کارندوں کے زریعے لوگوں پر حکومت کرتا۔ان کارندوں کا کام بادشاہ کے خزانے بھرنے کے لئے عوام کی آمدنی سے ٹیکس وصول کرنا اور کسانوں سے ان کی پیداوار کا حصہ وصول کرنا ہوا کرتا تھا۔

7- سلطنت پر رعایا کی تعلیم روزگار صحت رہائش کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی بس ٹیکس ہی وصول کیا جاتا۔قحط کے دنوں میں کسانون کی پیداوار سے وصول کئے گئے اناج کے بھرے ذخیروں میں سے انہی کسانوں میں اناج خیرات کر دیا جاتا۔ یا رعایا پر عائد ٹیکسوں سے آمدنی کی رقم کا کچھ حصہ انہی کو خیرات کر دی جاتی۔

8- رعایا مقامی حاکم اور بادشاہ کا ہر حکم بلا چوں و چرا بجالانے کی پابند تھی کیونکہ اسی میں ان کی دین و دنیا کی فلاح تھی۔ رعایا کو زیادہ سے زیادہ اپنی مذہبی و سماجی رسومات ادا کرنے میں آزادی تھی۔

9- بادشاہت زرعی نظام معیشت کی پیداوار سیاسی نظام تھا۔ جب تک دنیا کی معیشت صرف زرعی رہی۔ بادشاہت کو کوئی چیلنج درپیش نہیں رہا۔ یہی نظام دنیا میں آخری اور ختمی سمجھا جاتا تھا۔

10- زرعی دور میں گھریلو دستکاری موجود تھی۔ پیداوار صرف ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کی جاتی۔ منافع کمانے کی غرض سے نہیں کی جاتی تھی۔ ضروریات دیہات ہی میں پوری ہو جاتیں۔ ہل بنانے کے لئے ترکھان پھالہ بنانے کے لئے لوہار کپڑے بننے کے لئے بافندہ۔ جوتا سینے کے لئے موچی گاؤں ہی میں موجود تھا۔

**عبوری دور:**

کچھ ممالک میں صنعتیں قائم ہونا شروع ہو گئیں جن میں پیداوار منافع کمانے کی غرض سے کی جانے لگی۔ کسانوں کے علاوہ دو نئے طبقے وجود میں آئے سرمایہ دار اور مزدور۔ سرمایہ علم



Sanjh LokRaj

معاشیات کی اصطلاح ہے۔ سرمایہ کو پونجی اور دولت سمجھنا غلطی ہے۔ دولت ایک جامد چیز ہے جو زیورات، نقدی، جائیداد اور بینک بیلنس کی شکل میں پڑی ہوتی ہے جبکہ سرمایہ ایک متحرک چیز ہے۔ جب دولت کسی ایسے کام پر خرچ کی جائے جو مزید دولت کمانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو روزگار بھی فراہم کرے تو وہ سرمایہ بن جاتی ہے۔

اسی طرح ممالک بھی کہ ہم عرب ممالک کو دولتمند ممالک اور یورپی صنعتی ممالک کو سرمایہ دار ممالک کہتے ہیں صنعت ہی دولت کو سرمائے میں تبدیل کرتی ہے۔ سرمایہ دار اور مزدور دونوں طبقوں کا وجود صنعت کا مرہون منت ہے۔ معیشت کی زبان میں تاجر بھی سرمایہ دار نہیں ہوتا۔ جن ممالک میں صنعتیں قائم ہوئیں ان کی پیداوار پر بادشاہوں نے بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ سوال پیدا ہوا کہ سلطنت کی کس خدمت کے عوض ٹیکس دیا جائے؟ ظاہر ہے بادشاہ کے ذاتی خزانے بھرنے کے لئے اپنی خون پسینے کی کمائی کیوں دی جائے۔ سرمایہ داروں نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا اور مزدور طبقے کو اپنے ساتھ ملا کر بادشاہوں کے خلاف طویل جنگ لڑی۔ جس کے نتیجے میں شخصی حکومت ختم ہو گئی اور ریاست کا ادارہ قائم کیا گیا۔ حکمرانی کے نئے طریقے کو سرمایہ دارانہ جمہوریت کہا جاتا ہے اسی وجہ سے جمہوری طرز پر قائم جدید ریاست سرمایہ داروں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کا ادارہ ہے۔

**جدید ریاست:**

1- ریاست تین مکمل طور پر آزاد اداروں پر مشتمل ایک ادارہ ہے (1) حکومت (2) قانون ساز ادارہ (مقنّنہ) (3) عدلیہ۔ پارلیمانی جمہوریت میں ریاست کا سربراہ صدر اور حکومت کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات دھیان میں رہے کہ حکومت ریاست کا ایک جزو ہے۔ ریاست کے باشندے شہری کہلاتے ہیں جو ریاست کی تشکیل کرتے ہیں۔

2- ریاست کا جواز معاہدہ عمرانی سمجھا جاتا ہے۔ جس میں شہری متعین مدت کے لئے سربراہ اور سربراہ حکومت کا انتخاب کرتے ہیں۔ مدت ختم ہو جانے کے بعد نئے انتخابات کے ذریعے حکومت کی تبدیلی عمل میں لائی جاتی ہے۔

3- قومی ورصوبائی سطح پر پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔ ممبران پارلیمنٹ اپنی



Sanjh Lok Raj

سوجھ بوجھ اور علم کا آزادانہ استعمال کر کے معیشت، تعلیم صحت کے علاوہ ریاست کے ہر جزو کے لئے قانون سازی کرتے ہیں۔ بلکہ عوام کے مفادات وحقوق کو قانون سازی کے لئے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

4- ایک دفعہ منتخب ہو گئے صدر اور وزیر اعظم کو پارلیمنٹ کے باہر سے کوئی طاقت معزول نہیں کرسکتی بلکہ پارلیمان کے اندر ہی سے عدم اعتماد کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

5- جدید ریاست کا کاروبار تحریری آئین کے تحت چلتا ہے۔ جس میں ریاست کے تینوں اداروں کی تنظیم، تقسیم اختیارات، فرائض و اعمال، مدت اور انتخاب کا تعین کیا جاتا ہے۔ شہریوں کے حقوق اور ان کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کو اسی آئین میں تحفظ دیا جاتا ہے۔

6- عدلیہ کا کام مقنّنہ کے بنائے ہوئے قوانین پر عملدرآمد کرنا۔ قانون کو سمجھنے میں اگر کوئی رکاوٹ ہو تو اس کی تشریح کرنا ہوتا ہے۔ عدلیہ خود کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔ عدلیہ حکومت کے متوازی ادارہ ہے۔ حکومت کے ماتحت نہیں جدید ریاست میں عدلیہ کو حکومت کے متوازی ادارہ رکھنے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر حکومت شہریوں کے حقوق غضب کرے یا بنیادی ضروریات کی فراہمی میں رکاوٹ بنے تو عدلیہ شہریوں کو ان کے حقوق دلا سکے۔

7- جدید ریاست بھی عوام پر عائد ٹیکسوں کے ذریعے چلتی ہے۔ مگر جدید ریاست کو یہ رقم تمام اداروں کے انتظام پر صرف کرنے کے علاوہ عوام کو بنیادی ضروریات تعلیم، روزگار، صحت، رہائش ارتحفظ فراہم کرنے پر خرچ کرنی پڑتی ہے۔

8- ریاست کی تعمیر نیچے سے اوپر کی طرف کی جاتی ہے۔ شہری ریاست کو بنانے والا ہوتا ہے۔ آئین اور ریاست اس کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔ آزاد رائے رکھنے، رائے کا آزادانہ اظہار کرنے۔ کام کاج اور روزگار کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اپنی رائے کا اظہار وہ سیاسی پارٹیوں میں شمولیت کے ذریعے کرتا ہے ریاست میں رہنے والا ہر شہری رنگ، نسل، جنس، زبان اور مذہب کی تفریق کے بغیر حقوق وعزت کے لحاظ سے برابر حیثیت رکھتا ہے۔ سیاسی تفریق، عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت کا اس کی شہریت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

Sanjh Lok Raj

9- جدید ریاست صنعتی سرمایہ دار نظام معیشت کی پیداوار ہے۔ جاگیردار طبقے نے بادشاہی نظام پیدا کیا تو صنعتی سرمایہ دار طبقے نے جمہوریت متعارف کروائی۔

10- بادشاہت کی طرح جمہوری نظام کو بھی آج حتمی نظام سمجھا جاتا ہے۔ جدید ریاست کو قبائلی دور سے گزر کر بادشاہی نظام سے ہوتے ہوئے صنعتی دور میں حتمی ادارہ مانا جاتا ہے۔ جب تک جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے علاوہ کوئی تیسرا طبقہ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو چیلنج نہیں کرے گا۔ تب تک یہی نظام آخری اور حتمی سمجھا جاتا رہے گا۔

## سلطنت اور ریاست میں فرق:

1- سلطنت ہمیشہ اوپر سے نافذ ہوتی ہے اپنے اعمال واحکام کو بھی اوپر سے نیچے کی طرف متعارف کرواتی ہے۔ جبکہ ریاست کی تعمیر نیچے سے اوپر کی طرف ہوتی ہے۔

2- سلطنت میں حکومت عدلیہ اور مقنّنہ بادشاہ کے تابع ہوتے ہیں یعنی مقنّنہ اور عدلیہ حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں جبکہ ریاست کے تینوں ادارے حکومت عدلیہ اور مقنّنہ برابر اور آزاد حیثیت رکھتے ہیں۔ حکومت ریاست کا محض ایک جزو ہے۔ ریاست عوام کی خدمت گار ہوتی ہے۔ حاکم نہیں۔

3- سلطنت میں شخصی حکومت کو جواز فراہم کرنے کے لیے اعلیٰ اور ادنیٰ نسل حاکم اور محکوم، ذات پات، رنگ، نسل، قوم، جنس کی تفریق کے نظریات کی ترویج کی جاتی ہے۔ اسی نسلی تفریق ہی کی بنیاد پر صلاحیتوں کو قدرتی طور پر تقسیم سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک خاص طبقہ ہی حاکمیت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جبکہ ریاست میں ہر فرد کو انسان ہونے کی بنیاد پر برابر ودیعت صلاحیتوں کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اور ہر انسان کی قدرتی طور پر برابر صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے موافق ماحول پیدا کرنا ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔ سلطنت صلاحیتوں کو دبانے پر اپنا زور صرف کرتی ہے۔

4- سلطنت کی رعایا کو صرف فرائض ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے رعایا کو مطیع رکھنے کے لیے ادارے قائم کیے جاتے ہیں۔ جبکہ ریاست کے شہری کے حقوق بھی ہوتے ہیں اور شہریوں کے ان حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے ادارے قائم کیے جاتے ہیں۔

5- سلطنت پر رعایا کی بنیادی ضروریات کی فراہمی مثلاً روزگار تعلیم، سہولیات صحت تحفظ



Sanjh Lok Raj

جان و مال کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی جبکہ ریاست کو عوام سے وصول کیے ہوئے ٹیکسوں کے بدلے بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دینی ہوتی ہے۔

6- سلطنت میں عدلیہ بادشاہ سے وفاداری کا حلف لیتی ہے اور ہر فیصلے میں بادشاہ کی وفاداری کو مدِنظر رکھتی ہے۔ جبکہ ریاست میں عدلیہ آئین، قوم و ملک سے وفاداری کا حلف لیتی ہے اور اپنے فیصلوں میں شہریوں کے حقوق کے تحفظ اور آئین و قانون کی بالادستی کو مدِنظر رکھتی ہے۔

7- سلطنت میں درباریوں کو بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر ہر کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ بادشاہ کی نظروں سے گرا ہوا درباری عوام کی نظروں سے بھی گر جاتا تھا۔ ریاست میں پارلیمنٹ کے ممبران کو عوام کی خوشنودی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی ممبر پارلیمنٹ عوام کی نظروں سے گر گیا تو آئندہ وہ پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بن سکتا۔

8- سلطنت کی تمام پالیسیاں چند لوگ ترتیب دیتے ہیں اور اوپر سے نافذ کر دی جاتی ہیں۔ ریاست میں پالیسی سازی میں عوام کو شریک کیا جاتا ہے سلطنت میں رعایا کو عوام کالانعام (حیوان) کی حیثیت حاصل ہے۔ ریاست میں شہری کو آزاد اور تمام صلاحیتوں کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

9- آج کے دور میں ضروری نہیں کہ کوئی شخص یا حاکم خود کو بادشاہ کہلائے ہر قسم کی شخصی حکومت خواہ وہ کسی سیاستدان کی ہو یا فوجی جرنیل کی آمریت کہلائے گی اور ایسی حکومت سلطنت قائم کر لیتی ہے۔ بادشاہ یا ڈکٹیٹر خود کو عقل کل سمجھتا ہے اور اپنے مشیر مقرر کر کے حکومت کرتا ہے جبکہ ریاست کا کاروبار شہریوں کی اجتماعی سوچ کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔

10- ہر قسم کی آمریت بادشاہی نظام ہی کا نعم البدل ہے۔ آج کی ریاست میں بظاہر تو تمام ادارے موجود اور آزاد ہیں مگر جب پارلیمنٹ بادشاہ کا دربار بن جائے اور عدلیہ آئین کی بجائے آمر سے وفاداری کا حلف لے لے۔ تمام ادارے حکومت کے ماتحت ہوں تو ایسی ریاست بھی سلطنت ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ آج سلطنتِ پاکستان ہے۔ بلکہ آغاز ہی سے قومی ترانے میں پاکستان کو سلطنت قرار دے دیا گیا تھا۔

Sanjh Lok Raj

## پاکستانی معاشرے اور ریاست کا تضاد

1- پاکستان میں ریاستی ڈھانچہ کالونیل آقاؤں نے مسلط کیا۔ اور یہ ملک بادشاہوں کی غلامی سے سیدھا غیر ملکی قبضے میں چلا گیا۔

کالونیل آقاؤں نے جو ریاستی ڈھانچہ یہاں مسلط کیا اس کا کردار استحصالی تھا۔ اس کے لیے قانون سازی غیر ملکی آقا کرتے تھے۔ عدالتیں انتظامیہ کے ماتحت تھیں اور انتظامیہ کالونیل آقا کی غلام۔ خاص طور پر یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ یہ ریاست کسی معاشرتی ارتقا یا عوامی تحریک کے مطالبے کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئی۔

2- کالونیل آقاؤں نے اپنے مقبوضہ علاقوں کو زراعت پر جامد کر دیا تاکہ وہ ان کی مصنوعات کی منڈی رہیں۔ اس کے لیے انہوں نے جاگیردار طبقہ پیدا کیا۔ جس کی وجہ سے معاشرے کا کلچر بھی زرعی ہی رہا۔

3- ریاست کے تمام ادارے، الیکشن، سیاسی پارٹیاں، منشور، آئین و قوانین، صنعتی طرز پیداوار اور سرمایہ داری نظام معیشت کی پیداوار ہیں۔ جبکہ ہمارا معاشرہ زرعی طرز پیداوار اور جاگیرداری نظام معیشت پر جامد کھڑا ہے اس تضاد کی وجہ سے سیاسی پارٹیوں پر منشور کی بجائے خاندانوں کی بادشاہت ہے۔ لوگوں کی وفاداریاں کسی پروگرام کی بجائے شخصیات سے ہیں۔ پاکستان میں سیاسی اور جمہوری عمل کے متعلق تمام سوالات کے جوابات اِسی تضاد میں ہیں۔

ریاست کے تاریخی سفر کا نتیجہ یہ ہے کہ ادارے غیر جانبدار نہیں ہیں۔

اگر معاشرہ زرعی ہو، اور جاگیردار طبقے کا ریاست پر قبضہ ہو تو ریاست ایک جدید بادشاہت کی شکل ہوتی ہے۔ اگر معاشرہ صنعتی ہو، اور سرمایہ دار طبقے کا ریاست پر قبضہ ہو تو ریاست سرمایہ دارانہ جمہوریت کی شکل ہوگی، اگر معاشرہ صنعتی ہو مگر اس کے کلچر کے برعکس محنت کش طبقہ خود سے سیاسی قوت پیدا کرنے کے قابل ہو جائے جو ریاست پر قابض ہو تو یہ لوک راج ہوگا۔

Sanjh Lok Raj

# سامراج

میں سامراج کی تشریح اپنی ذات کے تجربے سے کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو یہ ذوالفقار علی بھٹو کا زمانہ تھا۔ کالج کے نزدیک دیواروں پر لکھا تھا ''سامراج مردہ باد''۔ میں نے اپنے ایک ہم عمر سے پوچھا کہ سامراج کیا ہوتا ہے تو اس نے بتایا کہ سامراج امریکہ کو کہتے ہیں۔ حالانکہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ سامراج تو سیاسی معاشیات کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطب کچھ گہرا ہے اور ایسا ہے جیسے چند خاص ملکوں کے چند لوگوں کو ہمیشہ خوشحالی رکھنے کے لئے بہت سے ملکوں کے بے شمار لوگوں کے آگے بڑھنے کے عمل کو روکے رکھنا۔ 36 سال بعد میں نے اب اسی کالج کے کئی طالب علموں سے پوچھا کہ سامراج کیا ہوتا ہے۔ جب کہ اب اسی کالج کے اردگرد دیواروں پر جہاد کی فضیلت کے متعلق نعرے درج ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اب میڈیا بہت ترقی کر چکا ہے اور دنیا 36 سال آگے کی طرف قدم بڑھا چکی ہے تو ان طلباء کا سامراج کے بارے میں علم تازہ ترین اور پختہ ہو گا مگر مجھے حیرانی ہوئی کہ ان طلباء نے بتایا کہ انہوں نے تو سامراج کا لفظ زندگی میں پہلی مرتبہ میری زبان سے سنا ہے اور اس بھی زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی جب ان طلباء کو سامراج کے متعلق بتانے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے اکتاہٹ کا اظہار کیا۔ ایک طالب علم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ تو بڑی مشکل باتیں ہیں جن سے ذہن پر زور پڑتا ہے اور وہ ایسی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہیں جن سے ذہن پر زور پڑے۔

کوئی ایسی بات سننے کو تیار نہ ہونا جس سے ذہن پر زور پڑتا ہو یہ رویہ پیدا کرنا کسی بھی ایسے ملک کے حکمرانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے جو سامراج کا معاشی غلام ہو کہ وہ ایسی تعلیمی



Sanjh Lok Raj

پالیسی بنائیں جو لوگوں میں خود کو ماضی کے مطابق ڈھالنے کا شوق پیدا کرے۔

یہ رویہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص دن بھر محنت مزدور کر کے دس روپے کماتا ہو اور کوئی دوسرا شخص مختلف حیلوں بہانوں سے اُس سے آٹھ روپے ہتھیا لے۔ جس کے نتیجے میں پہلا شخص غربت و افلاس کا شکار رہ کر اپنے بچوں کو تعلیم نہ دلوا سکے۔ بیماریوں میں اپنا علاج نہ کروا سکے۔ حتیٰ کہ اُسے اپنے گھر کو چلانے کے لئے اپنی ہی لوٹی ہوئی دولت میں سے قرض لینا پڑے اور دوسرا شخص قرض دیتے وقت یہ شرائط رکھ دے کہ مقروض اس قرضے کا 70 فیصد اس طاقت کو قائم رکھنے پر خرچ کرے گا جو ہر ایسی سوچ کو کچلنے کے لئے بنائی گئی ہو کہ آخر ہماری محنت کی کمائی میں سے 80 فیصد کس طرح ہتھیا لئے جاتے ہیں۔

ویسے ہماری روزمرہ زندگی کا تجربہ کہ درخت زمین سے اپنی جڑوں کے ذریعے توانائی حاصل کرتا ہے اور اس کے پتے فوٹوسن کے عمل میں کاربن اور لکڑی بنا کر درخت کو بڑھاتے اور اس کی نشوونما کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی درخت پر آکاس بیل لگ جائے تو آکاس بیل کو خود کی نشوونما کے لئے زمین میں جڑیں گاڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو درخت کی جڑوں کی محنت سے بنائی ہوئی توانائی پر منحصر ہوتی ہے اس سے ایک تو درخت کی نشوونما رک جاتی ہے یعنی وہ توانائی جس نے درخت کو نشوونما دینی تھی وہ آکاس بیل کو پالنے میں لگ جاتی ہے اور پتوں کا عمل جس سے درخت کی شاخیں بڑھنی تھیں وہ آکاس بیل کے پھلنے پھولنے کے کام آتا ہے۔ یہ عمل ہی سامراجیت ہے یعنی اپنی نشوونما اور ترقی کے لئے دوسروں کی نشوونما روکنا۔

لیکن انسانی سماج میں سامراج جن قوموں کی نشوونما روک کر خود کو طاقتور بناتا ہے انہیں مرنے نہیں دیتا بلکہ زندہ رہنے میں ان کی کچھ مدد بھی کرتا ہے اس مدد کے ساتھ شرائط ہوتی ہیں جو طے کرتی ہیں کہ غلام قومیں کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہوسکیں۔

ویسے تو سامراج ارتقاء کے عمل سے گزرتے ہوئے سماج میں نئی نئی شکلیں بدلتا رہا ہے۔ لیکن صنعتی سماج میں ٹھوس منصوبہ بندی کے عمل سے سامراج نے خود کو ایک ادارہ بنا لیا ہے۔ جو عالمی سطح پر اپنے ذیلی اداروں کے ذریعے پوری دنیا پر قابض ہو چکا ہے۔

جدید سامراج کی ابتداء صنعتوں کی فاضل پیداوار کی کھپت کے مسئلے سے ہوئی۔ جیسا کہ



Sanjh Lok Raj

آپ کو علم ہے کہ زرعی معاشرے میں انسان دیگر ضرورتیں دستکاری سے حاصل کرنا تھا۔ جس کے لئے لوہار، ترکھان، جولاہا، رنگریز جیسے پیشے وجود میں آئے زراعت کے زمانے میں پیداوار معاشرے کی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے کی جاتی تھی۔ لیکن جب صنعت آئی تو اس نے پیداوار کو ہزاروں لاکھوں گنا بڑھا دیا۔ یہ پیداوار اپنے ملک کی آبادی کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ تھی یا پھر ان لوگوں کی قوت خرید سے کہیں زیادہ تھی۔ اور یہ پیداوار منافع کمانے کی غرض سے کی گئی تھی۔ اس پیداوار کی اندرون ملک کھپت کے لئے تو اتنی تگ و دو کی ضرورت نہیں تھی بس اتنا کافی تھا کہ ملک کی منڈی کا ایک بارڈر بنا کر احاطہ کیا جائے اور بیرون ملک سے آنے والی مصنوعات پر پابندی لگائی جائے تا کہ قومی صنعت کو محفوظ بنایا جائے اور اس کو فروغ ملے۔

دوسرا مرحلہ یہ آیا کہ صنعتکاروں نے زرعی معاشرے کے تمام ادارے ختم کر کے اپنی بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کی ضرورتوں کے عین مطابق نیا ریاستی ڈھانچہ تشکیل دیا اور اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنے ملک کے باہر جن ممالک پر قبضہ کیا یعنی اپنی کالونیوں میں اپنی مصنوعات کو ڈنڈے کے زور پر کھپایا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک چند صنعتی ممالک نے پوری دنیا کے 85% علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب ساری دنیا کی دولت چند ممالک کے صنعتکاروں کے ہاتھوں میں جمع ہو رہی تھی۔ جس سے بنک کے نظام نے جنم لیا۔ سرمایہ دار ملکوں کے درمیان بیسویں صدی میں دنیا کے وسائل کو لوٹنے اور منڈیوں پر قبضہ کرنے کیلئے جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوئم ہوئیں۔ سرمایہ دار ملکوں نے اپنی کالونیوں میں ایسا سماجی اور ریاستی ڈھانچہ تشکیل دیا جو ان کے مفادات کا مستقل محافظ ہو۔ ان ممالک کی معیشت کو زراعت پر جامد رکھ کر انہیں اپنی مصنوعات کی مستقل منڈی رکھنے کے لئے جاگیردار طبقہ پیدا کیا اور انہیں ایک سیاسی قوت بنایا ان کی مدد کے لئے تھانہ کورٹ کچہری قائم کیں۔ ایسا تعلیمی نظام متعارف کروایا جو سامراج کے معاشی مفادات کا محافظ ہو۔ غلام رہنے پر فخر کرے۔ سامراج کی مدح سرائی کرے۔ پھر فوج کو پورے ڈھانچے کا محافظ بنایا۔ پاکستان میں اب تک 4 مارشل لاء لگ چکے ہیں۔ چاروں مارشل لاء وقت کے ہاتھوں کمزور ہوتی ہوئی جاگیرداری کو پھر سے طاقتور کرنے کے لئے لگائے گئے۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔



Sanjh Lok Raj

دوسری جنگ عظیم کے بعد تمام سرمایہ دار ممالک نے سبق سیکھا کہ اس طرح تو ہم خود ہی تباہ ہو جائیں گے کیوں نہ میز پر بیٹھ کر منڈیوں کی تقسیم کر لیں کالونیوں کی سماجی ساخت کو چونکہ سامراجی مفادات کے عین مطابق تشکیل دیا گیا تھا اس لئے وہاں سے مزاحمت کی امید نہیں تھی۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد جو ممالک بظاہر آزاد بھی ہو گئے مگر پھر بھی معاشی لحاظ سے اپنے کالونیل آقاؤں کے غلام ہی رہے۔ پھر ملٹی نیشنل کمپنیاں وجود میں آئیں اجارہ داریاں قائم ہوئیں۔ صنعتی سرمایہ اب مالیاتی سرمایہ میں تبدیل ہو گیا۔ آئی ایم ایف، ورلڈ بنک، ڈبلیو ٹی او۔ اب جدید سامراج کے اداروں کی شکل میں پوری دنیا پر قابض ہے۔

Sanjh Lok Raj

# لوک راج

جس طرح آم کا درخت ایک خاص فضا ور آب و ہوا میں پھل دیتا ہے اسی طرح اخروٹ کا درخت بھی ایک خاص آب و ہوا اور سرزمین میں پھل دیتا ہے۔ آم کے درخت کو بار آور ہونے کے لیے گرم آب و ہوا جبکہ اخروٹ کو پھل دینے کے لیے سرد آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ کئی دفعہ تجربہ کیا گیا ہے کہ اخروٹ کا درخت پنجاب کی گرم آب و ہوا والی سرزمین پر اُگایا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ درخت پوری نشوونما پا گیا مگر اُسے پھل نہیں لگا۔ اسی طرح سعودی عرب اور امریکہ برطانیہ جیسے ممالک نے آم اُگانے کی کوشش کی مگر نتیجہ یہ کہ درخت نے مکمل نشوونما پائی مگر پھلدار نہ بن سکا۔ اسی طرح مختلف اداروں کے ظہور پذیر ہونے میں بھی اردگرد کے کئی عوامل مددگار ہوتے ہیں۔ خاص ادارے خاص سماجی سیاسی و معاشی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یعنی اداروں کا ظہور پذیر ہونے اور مسلط ہونے میں فرق ہے۔

ادارے کا ظہور پذیر ہونا اور مسلط ہونا یہ دو الگ الگ باتیں ہیں اگر انہیں ذہن میں رکھا جائے تو ہم پاکستان میں کالونیل ورثے کے طور پر مسلط کیے گئے ریاست کے تینوں اداروں کے کردار کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ سماجی سائنس کا قانون یہ ہے کہ کسی معاشرے کا کلچر اور سیاسی نظام اُس معاشرے کے معاشی نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ جیسے زرعی معاشرے کا کلچر بھی جاگیرداری ہوتا ہے یہ کلچر ہمیں استاد شاگرد، حاکم رعایا، پیر مرید، والد اور بچے حتیٰ کہ میاں بیوی کے رشتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ جبکہ صنعتی معاشرے میں یہ تعلقات بدل جاتے ہیں۔ یہ تعلقات والد اور اولاد، استاد شاگرد، ریاست اور شہری اور برابری کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ برطانوی پولیس وزیراعظم کے بیٹے کے چالان کر دیتی ہے۔



Sanjh Lok Raj

پاکستان پر جو ریاستی ڈھانچہ مسلط ہے وہ کالونیل آقاؤں نے مسلط کیا ہے یہ ریاستی ڈھانچہ اور متعلقہ ادارے یورپ میں صنعتی معاشی نظام کی تکمیل اور صنعتی معاشرے میں لوگوں کے بنیادی حقوق کے حصول کے لیے ظہور پذیر ہوئے۔ ہندوستان پر جو کہ ابھی بادشاہت کے زرعی معاشی دور سے گذر رہا تھا ان پر مسلط کر دیئے گئے۔ یہاں ان اداروں کا کردار استحصالی ہے۔

اب ایک دوسرے مشاہدے کی طرف آئیں۔ جب ابھی سیمنٹ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ تو پکی اینٹوں کی گارے سے چُنائی کر کے مکان تعمیر کیا جاتا تھا۔ کمروں کی چھت پر شہتیر اور بالے ڈالے جاتے تھے اور عمارتیں تین منزل سے زیادہ نہیں اُٹھائی جاسکتی تھیں۔ جب سیمنٹ کا زمانہ آیا تو چھت پر لینٹر ڈالا جانے لگا۔ لینٹر اتنا وزنی ہوتا ہے کہ گارے کی چُنائی والی دیواریں اُسے اُٹھا نہیں سکتیں اور پھٹ جاتی ہیں۔ اس کا علاج اس طرح کیا گیا کہ اب دیواروں کی چُنائی بھی سیمنٹ سے کی جانے لگی۔ لیکن اگر دیواریں کچی ہوں اور ان پر لینٹر ڈالا جائے تو وہ اس کا بوجھ کب تک برداشت کر سکتی ہیں۔ اس سے سمجھانا مقصد یہ ہے کہ ریاست کے ادارے پارلیمنٹ جمہوریت، عدلیہ، انتظامیہ، آئین، سیاسی جماعتیں، فوج، تعلیمی ڈھانچہ پیدا تو صنعتی دور میں ہوئے مگر ہندوستان میں ان کے لینٹر کو زرعی دور کے کلچر کی ناپختہ دیواروں پر مسلط کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں آج تک سمجھ ہی نہیں آئی کہ کیا ہم ان یورپی اداروں ہی کے کالونیل کردار کو تبدیل کر کے انہیں عوامی خواہشات اور امنگوں کے تابع کرنے میں زندگی صرف کر دیں یا کوئی ایسا متبادل بھی ذہن میں رکھیں جس کو ہماری دھرتی نے پیدا کیا ہو۔ یورپ میں جمہوریت کا مطلب ہے عوام کی اقتدار میں شرکت جبکہ پاکستان میں اس کا مطلب ہے جمہوریت کے نام پر جاگیرداروں کی منتخب بادشاہت قائم کرنا۔ فوج چونکہ کالونیل مفادات کی اس خطے میں آج بھی محافظ ہے۔ سرکاری سطح پر تعلیمی نظام اور میڈیا کے ذریعے بڑی منصوبہ بندی سے پھیلائی گئی ہندوستان دشمنی کی وجہ سے ہم فوج پر اتنی رقم خرچ کرتے ہیں جس سے ہمیں کروڑوں لوگوں کو غربت کی لائن سے نیچے زندگی گذارتی پڑتی ہے۔

لوگوں کو بیروزگار اور جاہل رکھنا پڑتا ہے۔ بے شمار لوگوں کو لاعلاج مرنا پڑتا ہے۔ اتنی طاقت ور، منظّم، مسلح اور امریکہ سے ڈکٹیشن لینے والی فوج اور جاگیرداری کلچر رکھنے والی داخلی طور

پر جمہوریت دشمن سیاسی پارٹیوں کی موجودگی میں پاکستان کے عوام اس ریاستی ڈھانچے کو کس طرح اپنی امنگوں کے تابع کریں گے۔

پھر اس ریاست کے ڈھانچے کی ساخت میں یہ پنہاں ہے کہ یہ سامراج ہی کی پالیسیوں کو ملک پر نافذ کرے گا۔ دنیا ایک جدید نوآبادیاتی دور سے گذر رہی ہے۔ جن ریاستوں پر کالونیل حکمران رہے ہیں وہاں آج بھی ان کی پالیسیاں چلتی ہیں۔ چونکہ اس کتابچے میں ''مالیاتی سرمایہ'' کا ذکر نہیں ہے جو اگلے کتابچے میں کیا جائے گا۔ اس میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی کہ مالیاتی سرمایہ اور WTO کے دور میں کس طرح کوئی ملک صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا؟ جب تک IMF اور ورلڈ بنک ان شرائط پر ہمیں قرضہ دیتا رہے گا کہ پاکستان میں کن کن خطوط پر معاشی نظام چلے۔ کن بنیادوں پر سیاسی نظام کھڑا ہو تو کس طرح یہ ریاست ڈھانچہ عوام کی خواہشات کے تابع ہوگا؟ تھوڑا تھوڑا ارتقا ہونا تو قدرت کا قانون ہے۔ وہ تو ہوتا رہے گا۔ جس کے لیے عدلیہ کی آزادی کی تحریک کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر عدلیہ کی آزادی اور افتخار محمد چوہدری کی بحالی میں طویل فاصلہ ہے جو طے کرنے باقی ہے۔ پاکستان کے بجٹ میں دفاعی بجٹ کے لیے صرف ایک فقرہ لکھا ہوتا ہے کہ ''250 ارب روپے دفاعی بجٹ ہوگا'' جب عدلیہ کی تقرریاں ادارہ خود کرے گا اور انتظامیہ کا محتاج نہیں ہوگا ساتھ ہی جب بجٹ میں عدلیہ پر خرچ ہونے والی رقم ایک فقرے میں لکھی ہوگی اور اس کی تفصیلات عدلیہ فنانس ادارہ خود طے کرے گا تب سمجھیں گے کہ اب عدلیہ آزاد ہے۔ بس فرق صرف یہ پڑے گا کہ عدلیہ کسی شخص کی بجائے طے شدہ آئین و قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی۔

یہ طے شدہ قانون آپ نے یا میں نے طے نہیں کیا۔ یہ پہلے تو کالونیل آقاؤں نے بنایا۔ پھر قانون سازی کا اختیار جاگیرداروں کی پارلیمنٹ یا سرمایہ داروں کا بنایا ہوا ہے۔ اس لیے آزاد عدلیہ کا مطلب ہوگا کہ وہ جاگیرداروں یا سرمایہ داروں کے بنائے گئے قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی۔ یہ بھی دراصل عدالتی بیوروکریسی ہے، کیا اس سسٹم کے متبادل کوئی نظام ہے؟

ہاں ہے۔ جس کو لوک راج کہتے ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے جاگیرداروں یا سرمایہ داروں کو فیصد میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہر سو کی آبادی میں ایک جاگیردار نہیں ہے۔ بلکہ کئی لاکھ کی آبادی میں ایک جاگیردار ہوتا ہے۔ اسی طرح کئی لاکھ کی آبادی میں ایک سرمایہ دار ہوتا ہے۔ لیکن پارلیمنٹ میں سو فیصد جاگیردار اور سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ اس کو عوامی نمائندگی کا نام دیا جاتا ہے۔ جبکہ شہروں کے علاوہ دیہات کا عام آدمی تو اپنی مرضی سے ووٹ بھی نہیں دے سکتا۔

جب پارلیمنٹ میں آبادی کے تناسب سے عام آدمی منتخب ہوں تو ایسی پارلیمنٹ لوک راج کہلائے گی۔ لوک راج کبھی لوگوں کی امنگوں پر مبنی منشور سے متفق محنت کش طبقے کی منظّم پارٹی کے بغیر ممکن نہیں۔

لوک راج میں ہر شہری کی تعلیم، روزگار، رہائش اور علاج ریاست کے ذمے ہوتا ہے۔ لوک راج کے لیے گاؤں کی سطح سے پنچائتیں بنا کر تحصیل ضلع اور صوبہ سے لے کر قومی سطح تک عام آدمی کی شرکت کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ جس سے شہری اور ریاست کا تعلق حاکم و محکوم کا نہیں ہوتا ایسی سیاسی پارٹی جس کی منزل لوک راج ہو وہ اپنے طبقے سے تعلق رکھنے والے معاشی ماہرین سے بیروزگاری کے خاتمے۔ سب کو ایک جیسی تعلیم، سب کے لیے ریاست کی طرف سے مفت علاج کی سہولت کی منصوبہ بندی کر کے اپنے ہی طبقے سے قیادت پیدا کر کے ان منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے سیاست کرتی ہے۔ کیونکہ محنت کش طبقے میں اپنے حقوق کا شعور بیدار کیے بغیر اور انہیں سیاست میں لائے بغیر لوک راج کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

محنت کش عوام کے لیے ایک اعلیٰ معیار زندگی کو یقنی بنانے کے لیے قیمتوں میں کمی، تنخواہوں میں اضافہ، ٹیکس ایک نیا نظام قائم کرنا۔ زرعی پیداوار کی سرکاری قیمت خرید میں اضافہ، ضروریات زندگی کی پیداوار میں سرکاری سرپرستی میں اضافہ، ٹیکنالوجی کی سیاسی و معاشی اہمیت کے پیشِ نظر ٹیکنالوجی انقلاب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عوام الناس کی دانش سے استفادہ ۔ زراعت میں مشین کاری اور زرعی مداخل یعنی کھاد۔ بیج کیڑے مار ادویات کی پیداوار کو اندرون ملک قومی صنعت کے ذریعے ممکن بنا کر انتہائی سستے داموں فراہمی ۔ اشتراکی زراعت کے انتظام اور طریقۂ کار کا تعین کرنا اور اس طرح کے کئی ایسے کام ہیں جن کے لیے

سانجھ کے متروں کی تربیت لازمی ہے۔ لوک راج کی تعمیر میں متروں کی تعلیم، ذاتی تربیت، تنظیم، شعبہ بندی، عملی جامہ پہنانے کے لیے حکمت عملی، عوام الناس کی شمولیت، ماضی پرستی سے چھٹکارا، آگے بڑھنے کے نئے راستوں کی تلاش، نیا فن و ثقافت، نیا فلسفہ درکار ہے۔ سانس لیتے رہنے کو زندگی نہیں کہتے۔ کسی عظیم مقصد کے حصول کی جدوجہد میں جتنے سانس لیے وہ زندگی ہے۔

Sanjh Lok Raj

# بیری دی چھاں

چنگ چوکھی واہی کیتی
لک بنھ خوب کمائی کیتی
کنکاں چھولے منڈی سٹے
دانے ویچ کے پیسے وٹے

پنڈوں پیسے شہر اپڑائے
صابن تیل تے لون لیائے
نکے شہر دے نکے تاجر
پیسے وڈے شہر نوں گھلے
وڈے شہر توں نکے شہر نوں
ٹافیاں بسکٹ فیڈ رچلے

وڈے شہر توں ٹر کے پیسے
گئے جاپان تے کوریا ولے
اوہناں اوتھوں پیچ پلاسا ں
سنھیاں آریاں قبضے گھلے
سنگاپور توں ویڈیو آ گئے
لندنوں آ گئے لتھے لیڑے
امریکوں امریکن سنڈی
گولے بمب برود تے کیڑے

شہراں والیاں پنڈاں نوں
مڑ رنگ برنگے دارو گھلے
کنک گئی مڑ شہراں ولے
دارو رہ گئے ساڈے پلے

ویچے بڑے نیں نرمے مونجی
اجے وی ساڈے گھر دی پونجی
اک بلد تے اک گھڑاپ اے
او یہو کھنگ تے او یہو تاپ اے

کل منافع محنت دا بس
خادم مرلہ تھاں بچدی اے
اک کٹورہ لسی دا تے
اک بیری دی چھاں بچدی اے

خادم چشتی

Sanjh Lok Raj